
اٹھو
دو
اٹھو
اور گواہی دو
ڈاکٹر علی شریعتی

اٹھو اور گواہی دو

ڈاکٹر علی شریعتی۔

میرے لیے آج شہادت کے بارے میں بات کرنا مشکل ہے کیونکہ آج شیعوں کی شہادت امام حسین علیہ السلام کی برسی ہے۔

امام حسین علیہ السلام اور تاریخ میں ان کے کردار کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا گیا اور بہت کچھ لکھا اور کہا جا رہا ہے۔ اسلاف نے اسے ایک طرح سے سمجھا دیا ہے اور اختراعی دانشوروں نے دوسرے طریقے سے۔ لیکن جیسا کہ میں نے حال ہی میں محسوس کیا، ہم یہ نہیں جان سکتے کہ امام حسینؑ نے کیا کیا ہے، یہ سمجھے بغیر کہ شہادت کا اصل معنی کیا ہے۔

ایک طرف حسین کی عظمت اور ان کے انفرادی نظریات نے اس کے کرشمے کی چمک سے اس چیز کو چھپا دیا ہے جو خود حسین سے بڑا ہے۔ جو حسین سے بڑا ہے وہ ہے جس کے لیے حسین کو قربان کیا گیا۔ ہم نے ہمیشہ حسین کے بارے میں بات کی ہے لیکن ہم نے اس مقصد کے بارے میں شاذ و نادر ہی بات کی ہے جس کے لیے حسین نے اتنی دل کھول کر قربانی دی۔

آج میں نے اس قربانی کے تصور کے بارے میں بات کرنے کا ارادہ کیا جو حسین اور ان جیسے لوگوں نے کی ہے اور تاریخ انسانی اور ہمارے مذہب میں ایسی خود قربانیوں کی عظمت ہے۔

اور اس طرح، لوگوں، مخلوق اور خالق کی موجودگی میں، میں اس خیال کا حوالہ دینا چاہتا ہوں اور اس کے معنی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جیسا کہ ان کی زندگی اور موت کے مجموعہ سے ظاہر ہوتا ہے، اس خیال کو 'شہادت' کہتے ہیں۔

یہ ایک مشکل کام ہے۔ شروع میں، میرا علم اور میری علمی صلاحیت مجھے اتنی مشکل کام انجام دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ متضاد پیٹرن جس کی پیروی یہ مسئلہ ہے (کم از کم میرے حوالے سے) میری پوزیشن کو مزید مشکل بنا دیتا ہے۔ ایک طرف میں شہادت کو فکری، سائنسی اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے پیش کرتا ہوں۔ میں صرف اپنا سر استعمال کر سکتا ہوں۔ صرف سائنس اور منطق ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔

دوسری طرف شہادت کی کہانی اور وہ جو شہادت کو چیلنج کرتی ہے اتنی حساس، اتنی پیاری ولولہ انگیز ہے کہ روح کو آگ کی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یہ منطق کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اس سے تقریر کمزور ہوتی ہے۔ یہ سوچنا بھی مشکل بنا دیتا ہے۔ شہادت ایک نفیس محبت اور گہری پیچیدہ حکمت کا مرکب ہے۔ ،ایک، ان دونوں کا ایک ہی وقت میں اظہار نہیں کر سکتا اور اس کے نتیجے میں کوئی ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر، میرے جیسے شخص کے لیے، جو جذباتی اور روحانی طور پر کمزور ہے، یہ اور بھی مشکل ہے۔ لیکن میں اپنی پوری کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ میں کچھ چیزوں کو بتانے میں کامیاب ہو جاؤں گا جن کا اظہار کرنا میرا ارادہ ہے۔

شہادت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے جس نظریاتی مکتب سے یہ معنی لیتا ہے، اس کے اظہار اور اس کی قدر و قیمت کو واضح کرنا چاہیے۔

یورپی اور مغربی زبانوں میں، ایک شہید وہ ہے جو اپنے دشمن کے خلاف اپنے عقائد کے دفاع میں 'موت' کا انتخاب کرتا ہے جہاں اس کے لیے موت کا واحد راستہ ہے۔ لیکن الفاظ، شہادت: اٹھو اور گواہی دو، جو اسلامی ثقافت میں موجود ہے کہ جس نے 'موت' کا انتخاب کیا ہے اس کے اظہار یا نام کے لیے مغربی لفظ شہادت سے بالکل مختلف معنی رکھتے ہیں۔ یہ اسلامی اور غیر اسلامی رسومات کے درمیان فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ یورپی ممالک میں شہید کا لفظ مرٹل' سے نکلا ہے جس کا مطلب 'موت' یا 'مرنا' ہے۔ اسلام اور خاص طور پر'

'شیعه ثقافت میں بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے، تاہم 'قربانی اور گواہی دینا ،' ہے۔ لہٰذا شہادت یعنی موت کے بجائے بنیادی طور پر اس کا مطلب ہے 'زندگی ثبوت'، 'گواہی'، 'تصدیق'۔ یہ الفاظ: شہادت اور شہادت ان فرقوں کو ظاہر' کرتے ہیں جو شیعہ اسلامی ثقافت اور دنیا کی دوسری ثقافتوں کے درمیان موجود ہیں۔

اس کا سکول آف تھاٹ

[لہٰذا] شہادت کے تصور کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس کا مطالعہ اس مکتب فکر اور عمل کے تناظر میں کرنا چاہیے جس پر اس کی بنیاد ہے اور اس مکتب فکر میں جس کا حسین مظہر ہے۔ بنی نوع انسان کی کہانی میں تاریخ کے بہاؤ اور جدوجہد میں، حسین اس جدوجہد کے معیاری علمبردار ہیں اور ان کی کربلا جو میدان ،جنگ کے درمیان میدانِ جنگ ہے، وہ واحد کڑی ہے جو مختلف محاذوں مختلف نسلوں اور مختلف زمانوں کو یکجا کرتی ہے، تاریخ کے آغاز سے لے کر موجودہ لمحے تک اور مستقبل میں رواں دواں ہے۔

ہوسین کا مفہوم اس وقت واضح ہو جاتا ہے جب ہم تحریک کے اس بہاؤ سے اس کے تعلق کو سمجھتے ہیں جس پر ہم نے پہلے لیکچرز میں بحث کی ہے جو تاریخی طور پر ابراہیم سے شروع ہوتی ہے۔ اس معنی کو واضح کیا جائے اور حسین کے انقلاب کی تشریح کی جائے۔ حسین اور کربلا کی معرکه کو تاریخی اور سماجی حالات سے الگ تھلگ دیکھنا ہمیں مجبور کرے گا، جیسا کہ ہم میں سے بہت ،سے لوگوں کے لیے ہے، انسان اور اس واقعے کو خالصتاً ایک بدقسمتی کے طور پر اگر ماضی میں کوئی المناک واقعہ نہ ہو اور ہمارے لیے محض رونے کی چیز ہو (اور ہم یقیناً روتے رہتے ہیں) کو ایک غیر حقیقی اور غیر حقیقی کے طور پر دیکھیں۔ کربلا اور حسین کو ان کے تاریخی اور نظریاتی تناظر سے الگ کرنا ایک زندہ جسم کو جدا کرنا، اس کے صرف ایک حصے کو نکالنا اور جسم کے نظام حیات سے خارج کر کے اس کا جائزہ لینا ہے۔

انبیاء کے دو طبقے

جیسا کہ میں نے اپنے پچھلے لیکچرز میں ذکر کیا ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں مذہبی تحریکیں، خواہ وہ مذاہب کے مندرجات اور انبیاء اور بانیانِ دین کے طرز عمل سے متعلق ہوں یا مذہب کے رہنماؤں کے سماجی طبقاتی روابط اور جس کی طرف وہ لوگوں کو بلا رہے تھے، دو طبقوں میں تقسیم ہیں۔ اس درجہ بندی کے مطابق تمام تاریخی انبیاء، خواہ وہ سچے ہوں یا جھوٹے، نیز جس نے بھی مذہبی تحریک شروع کی ہو، دو مختلف طبقوں میں تقسیم ہیں:

پہلا گروہ اس مذہبی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے جس کی بنیاد ابراہیم نے رکھی تھی۔ انبیاء کا یہ سلسلہ تاریخی نقطہ نظر سے ہم سے زیادہ قریب ہے اس لیے ہم انہیں بہتر جانتے ہیں۔ وہ انبیاء پر مشتمل ہیں جن کا معاشرے کے بارے میں نظریہ معاشرے کے سب سے محروم سماجی اور معاشی طبقے سے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ محمد (ص) نے کہا، یہ تمام انبیاء یا تو چرواہے تھے، جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، وہ بھیڑ بکریاں چراتے تھے، یا کچھ سادہ بھوکے کاریگر یا مزدور تھے۔

یہ انبیاء دوسرے گروہ کے پیغمبروں یا فکری اور اخلاقی مکاتب فکر کے بانیوں جیسے چین، ہندوستان، ایران اور ایتھنز کے سائنسی اور اخلاقی مکاتب فکر کے بانیوں کے برعکس کھڑے ہیں۔ یہ مؤخر الذکر گروہ، بغیر کسی استثنا کے، اشرافیہ تھا۔ وہ اپنے معاشرے کے شریف، طاقتور، آرام دہ طبقے سے پیدا ہوئے۔

پوری تاریخ میں، معاشرے کے طاقتور حکمران تین گروہوں میں سے ایک رہے ہیں: طاقتور، امیر اور پادری۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی اور معاشی طاقت کا استعمال کیا اور لوگوں کے ایمان پر قابو پالیا۔ انہوں نے عوام پر حکومت کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا۔ ان کا اشتراک، خواہ وہ یکساں خیالات رکھتے ہوں یا نہ ہوں، عوام پر حکومت کرنے اور عوام کی خاطر تھا۔

ہند-چین سے لے کر ایتھنز تک تمام غیر ابراہیمی رسول یا تو اپنی ماں کی طرف سے یا اپنے باپ کی طرف سے یا یہاں تک کہ دونوں طرف سے بادشاہوں، پادریوں اور

اشراقیہ سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ کنفیوشس، لاؤ زو، بدھ، زراسٹر، مانی، مزدک، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے لیے درست ہے۔ جبکہ قرآن اس بات پر تاکید کرتا ہے کہ ''ہم نے عام لوگوں میں سے ایک نبی مبعوث کیا۔ (3:163)۔ وہ عوام اور برادری میں سے عام لوگ تھے۔ اس طرح ابراہیمی انبیاء لوگوں کی جماعت سے پیدا ہوئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس کوئی فرشتہ طول و عرض نہیں تھا یا یہ کہ وہ مطلق اختیارات نہیں رکھتے تھے اور صرف انسان تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کا تقرر معاشرے کے کسی خاص، اعلیٰ اور منتخب طبقے سے تعلق رکھنے کے بجائے عام لوگوں کے درمیان سے کیا گیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ پیغمبر اسلام عربوں میں سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے انہیں عربی بولنی چاہیے، یا موسیٰ، جو یہودیوں کے لیے مقرر کیے گئے تھے، کو عبرانی بولنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ عربوں میں سے مبعوث ہونے والا نبی عربی کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں بول سکتا۔

اہم بات یہ ہے کہ عام لوگوں کی زبان میں بات کی جائے جس کا مطلب ہے زبان بولنا اور وہ محاورات استعمال کرنا جن کو اس کمیونٹی کا عوام سمجھتا ہے۔ اپنی ضرورتوں یا پریشانیوں کے بارے میں ایسی زبان میں بات کرنے کے لیے جو ان کے لیے قابل فہم ہو، نہ کہ فلسفیوں، شاعروں، دانشوروں، اسکالروں اور پڑھے لکھے لوگوں کی حیثیت سے، انھیں ایسی زبان اور محاورات کا استعمال کرنا چاہیے جس سے لوگ واقف ہوں۔ لیکن، وہ نہ تو عام لوگوں کے خیالات اور جذبات کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کی زبان کو سمجھتے ہیں۔ یہ اب بھی ہر جگہ نوٹ کیا جا سکتا ہے۔ جب ہم ابراہیمی انبیاء کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم لوگوں کی بات کر رہے ہیں، کیونکہ ان انبیاء کا مشن دوسرے سے مختلف ہے۔

غیر ابراہیمی رسولوں کا مشن ہمیشہ موجودہ طاقت کے ڈھانچے سے متعلق ہے تاکہ طاقت ان رسولوں کے نظریات کی حمایت کرے۔ دوسری طرف ابراہیمی

انبیاء کو اپنے وقت کے طاقتور حکمرانوں کے خلاف ہمیشہ عام لوگوں کی حمایت حاصل رہی۔

ابراہیم کو دیکھو۔ جیسے ہی خدا نے اسے مقرر کیا، اس نے بتوں کو تباہ کرنے کے لیے اپنی گدی کا استعمال کیا۔ موسیٰ نے اپنے چرواہے کی لاٹھی اٹھائی اور فرعون کو نیچے لایا، Croesus محل پر دھاوا بول دیا۔ اس نے دولت مند اور طاقتور کے اسے زمین میں دفن کر دیا اور فرعون کو سمندر میں غرق کر دیا۔ اور پیغمبر اسلام پہلے انفرادی ترقی کے مرحلے سے گزرے، پھر اپنی روحانی جدوجہد کا آغاز کیا۔ 10 سال کے عرصے میں اس نے 65 لڑائیاں لڑیں، یعنی ہر 50 دن بعد ایک جنگ، ایک فوجی مقابلہ۔ ابراہیمی انبیاء کے معجزات بھی ان کے مشن کے مطابق ہیں۔ لاٹھی کو سانپ میں بدلنا جادوگری کو تباہ کرنے اور فرعون کے تخت پر حملہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

قرآن واضح طور پر اس اصول کا اعلان کرتا ہے کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے کیونکہ درحقیقت پوری تاریخ میں صرف ایک ہی مذہب رہا ہے۔ اس دین کو اس وقت کے حالات کے مطابق اور اس دور کی ضروریات کے مطابق قائم کرنے کے لیے ہر نبی کو مبعوث کیا گیا۔

صرف ایک ہی دین ہے اور اس کا نام ہے "اسلام"۔ اس اعلان کے ذریعے نبی اسے عالمگیر بناتا ہے اور عرض کرنے کے تصور کو ایک آفاقی، تاریخی نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ وہ اسلامی تحریک کو دوسری تحریکوں سے جوڑتا ہے جو پوری تاریخ میں لوگوں کو آزاد کرنے کے لیے لڑی جاتی رہی ہیں۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، طاقتوروں، دولت مندوں اور دھوکے بازوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے وژن کی وحدت کو ظاہر کیا ہے: ایک روحانی جدوجہد، ایک مذہب، ایک جذبہ اور ایک نعرہ پوری انسانیت کی پوری تاریخ میں تمام شعبوں، ہر دور اور تمام نسلوں میں۔

آئیے قرآن کی اس آیت پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور اس کے تاریخی تناظر اور الفاظ کے چناؤ پر غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں تاریخی تناظر کو کس طرح بیان کیا گیا ہے اور دیکھتے ہیں کہ یہ ان تحریکوں کو یکے بعد دیگرے کیسے جگہ دیتا ہے۔

جو لوگ خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو انصاف کے لیے بولتے ہیں... (3:21)

ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں تین نکات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اول خدا کی نشانیاں، دوم انبیاء اور سوم وہ مرد جو کفار کی مخالفت میں برابری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انبیاء اور اہل انصاف کو ایک درجہ پر رکھا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں انسانی تاریخ کے ایک قسم کے سماجی تصادم اور فلسفہ اور سابقہ تحریکوں کی تفصیل کس طرح بیان کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام اس فرمانبرداری کے دین کے آخری رسول ہیں، جسے پوری تاریخ میں، جیسا کہ قرآن نے بار بار دکھایا ہے، انبیاء علیہم السلام لے کر آئے۔ ان کا پیغام حکمت، کتاب اور دنیا کے لیے انصاف پر مشتمل تھا۔ پیغمبر اسلام اس دنیا اور انسانی تحریک کے آخری پیغمبر ہیں جنہوں نے تسلیم (اسلام) کے نام پر لوگوں کو خدا اور ایک کی بندگی کے لئے بلایا تاکہ وہ اس کے علاوہ کسی کی اطاعت اور بندگی سے آزاد ہوجائیں۔

پیغمبر اسلام توحید کے آفاقی نظریہ کی تصدیق کے لیے تشریف لائے اور حتیٰ کہ اس وحدت کو انسانی تاریخ میں تمام نسلوں، قوموں، گروہوں، خاندانوں اور سماجی طبقات تک پہنچانے اور مشرک مذاہب کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے تشریف لائے۔ اسلامی اتحاد کا نعرہ وہ نعرہ تھا جس نے آزادی دی۔ اس سے پہلے کہ ،دانشوروں، اہل علم، پڑھے لکھے اور فلسفی اس سے واقف ہوتے، غلام، مظلوم بھوکے اور ذلیل لوگ اس سے حساس اور باخبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو گروہ مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوا وہ سب سے زیادہ

محروموں میں سے تھا، جنہیں ذلیل کیا گیا تھا اور معاشرے کے سب سے ذلیل عناصر میں سے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دشمنوں نے اس لیے لعن طعن کیا کہ آپ کو صرف انسانیت کی خستہ حالی نے گھیر رکھا تھا۔ اس تحریک کی آج یہ سب سے بڑی تعریف ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بدھ مذہب کے رہنما چین اور ہندوستان کے تمام رئیس اور اشرافیہ ہیں۔ آج اقدار !بدل گئی ہیں

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے ان غلاموں کے لیے ایک اہم موڑ قرار دیا جو پوری تاریخ میں اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ان کا انجام غلامی ہے۔ غلاموں اور ذلیلوں کو مذہب، سائنس، فلسفہ یا زمانے کی زبان سے یا شاعری یا فن کی زبان سے یہ باور کرایا جاتا تھا کہ ان کا مقدر اپنے آقا کی خدمت کرنا ہے اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ صرف اور صرف مصائب برداشت کرنے، بھاری بوجھ اٹھانے اور بھوکے رہنے کے لیے موجود ہیں تاکہ دوسروں کو خوشی ملے۔ وہ اسی کے لیے پیدا ہوئے اور پیدا ہوئے۔

،یہ محروم طبقہ جو اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ دیوتا یا خدا ان کے دشمن ہیں ان کا خیال تھا کہ دنیا کو چلانے اور لوگوں کے کاموں کی انجام دہی کے لیے انہیں بوجھ اٹھانے کے لیے پورٹر بنایا گیا ہے۔ یا جیسا کہ حضرت منیٰ نے روشنی اور اندھیرے کی بات کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ’’متاثر اور شکست خوردہ تاریکی کے جوہر میں سے ہیں اور فاتح روشنی کے جوہر سے ہیں‘‘۔ ارسطو اور افلاطون، جو وہ دانشور تھے، نے کہا تھا کہ "خدا یا قدرت نے کچھ کو مخلوق کے غلام اور کچھ کو آزاد بنایا ہے تاکہ غلام عام کام انجام دیں اور آزاد پھر اعلیٰ امور مثلاً "اخلاق، شاعری، موسیقی اور تہذیب کے لیے آزاد ہو سکیں۔

پیغمبر اسلام کو اس تحریک کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا تھا جو پوری تاریخ میں فریب، باطل، شرک، تفرقہ بازی، نفاق، اشرافیہ اور طبقاتی تفریق کے خلاف چلی تھی، جسے روحانی جدوجہد کا مقصد بنایا گیا تھا اور تمام انسانیت ایک

نسل، ایک ذریعه، ایک فطرت اور ایک خدا ہونے کا اعلان کر کے تمام لوگوں کے لیے معاشی اور اقتصادی طاقت کے ذریعے مساوات کا اعلان کیا گیا تھا۔ سماجی مساوات کو برقرار رکھنے کے لیے نظام۔

مدینه کی مثالی سوسائٹی کو ہی لے لیجئے جہاں ایک ذلیل غلام بلال کو عرب معاشرے کے اشرافیه سے زیادہ شریف اور زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ،سب نے اس کے موقف کو تسلیم کیا۔ اچانک مدینه کے باشندے، عرب، یہودی قریش اپنے آپ کو حذیفه کے نوجوان غلام کو برابر کی طرح سلام کرتے ہوئے پاتے ،ہیں، وہ جو کبھی تنگ گلیوں میں ایک ذلیل اور محروم غلام کی طرح گھومتا تھا ،اب مسجد غزوہ میں ہجرت کرنے والے بزرگوں کے سامنے نماز کے لیے کھڑا ہے قارورہ کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ زمانه جاہلیت اور یہاں تک که موجودہ دور کے ممتاز ترین لوگ آپ کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔

تمام قدریں اس وقت بکھر گئیں جب خود نبی صلی اللہ علیه وسلم نے جاہلیت اور اشرافیه کی تمام اقدار کو ختم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے انہیں ہدایت کی که وہ جو لمبے، بہتے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اسے چھوٹا کریں اور اپنی لمبی داڑھیاں تراش لیں جو که اشرافیه کی نشانیاں ہیں۔ اس نے لوگوں کو حکم دیا که وہ سڑکوں پر فخر سے نه چلیں۔ اس نے لوگوں کو ایک وقت میں دو گھوڑے پر سوار ہونے کی ہدایت کی۔ ایک آگے اور دوسرا پیچھے۔ بعض اوقات اشرافیه کی قدروں کو لوگوں کی نظروں میں گرانے کے لیے وہ ننگی پیٹھ پر گدھے پر سوار ہو جاتا۔

ایک دن ایک بوڑھی عورت جس نے کئی برسوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم کی عظمت و شان کو سنا تھا، آپ صلی اللہ علیه وسلم کے سامنے آئی۔ وہ اس کی موجودگی کے خوف سے زبان بندھے کھڑی تھی۔ آپ صلی اللہ علیه وسلم نے نرمی سے، نرمی سے اور سادگی سے اسے کندھے سے پکڑ کر فرمایا، "تم کیوں ڈرتی

ہو؟ میں اس قریش عورت کا بیٹا ہوں جو بکریوں کا دودھ دیتی تھی، تم کس سے ڈرتے ہو؟"

جب یہ چرواہا جو آخری مبعوث ہوا، آخری رسول، خاموش صحراؤں سے اچانک اٹھ کر شہروں میں طاقت، دولت اور فریب کے مالکوں پر حملہ کرنے والوں کے لیے مر گیا، تو اچانک سب کچھ الگ ہوگیا۔ ان کی موت کے فوراً بعد اختلافات ظاہر ہو گئے۔ تاریخی واقعات کا راستہ سچے راستے سے پہلے ایک سینٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہٹتا تھا۔ مکتب اسلام اور تاریخ اسلام کے درمیان حق اور حقیقت کے درمیان جو زاویہ نظر آیا وہ شروع میں تنگ تھا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کے درمیان فاصلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ یہ دو لائنوں کے درمیان زاویہ کی طرح تھا جو پہلے ایک دوسرے کے قریب ہیں (ایک سینٹی میٹر کے ہزارویں سے زیادہ نہیں) لیکن آہستہ آہستہ فاصلہ بڑھتا ہے جیسے جیسے تاریخ آگے بڑھتی ہے۔ دونوں لائنیں اتنی چوڑی ہوتی ہیں کہ ہمیشہ کے لیے ان کے درمیان کلومیٹر کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اگر دوسرے عوامل اور اسباب ان کی طرح کام کرتے ہیں تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ دو لکیریں جو ایک زاویہ سے پھیلی ہوئی ہیں، اسلام کی حقانیت کی لکیر سے تاریخ کی لکیر کی طرح اس معاملے میں بھی الگ ہو جاتی ہیں۔

انحراف ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد انحراف، جو پہلے تو بہت ہی کم ہوتا گیا، ترقی کرتا گیا اور نسل در نسل ایمانداری، صداقت، سچائی اور انصاف کے درمیان فاصلہ اتنا بڑھتا گیا کہ 14 یا 15 سال کے بعد جب ہم عثمان کے پاس پہنچے تو انہوں نے ایک مقناطیسی قطب کی طرح ان تمام مخالف انقلابی ایجنٹوں کو اپنی طرف کھینچ لیا جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں اسلامی طاقت اور اسلامی تحریک کے مرکز میں جمع کیا۔ عثمان نے زمانہ جاہلیت کی ذہنیت اور اسلامی انقلابی دور کے درمیان ایک کڑی کا کام کیا۔ اس کی کڑی

خلافت تھی جس نے مسترد شدہ اشرافیہ کے انتہائی حقیر عناصر کے لیے ایک پل کا کام کیا جو ابھی تک قائم ہیں۔ انہوں نے ان عہدوں پر قبضہ کر لیا جو مہاجرین اور مددگاروں کی روحانی جدوجہد سے حاصل ہوئے تھے۔ عثمان نے خلاء ،کو پُر کیا اور اپنی خلافت عثمانیہ کے پل کے پار سے سب سے گندے، نیم مردہ اشرافیہ کے مسترد شدہ ایجنٹوں سے گزر گئے۔ انہوں نے وہ مقام حاصل کیا جو مہاجرین اور اصحاب رسول کے جہاد [مذہبی اور روحانی جدوجہد] سے حاصل ہوئے تھے۔

عثمان نے بنی امیہ کے آلہ کار کے طور پر کام کیا، جو اسلام کے سب سے بڑے دشمن تھے، اور ان کے ذریعے، انہوں نے نہ صرف پیغمبر کے زمانے میں جو ضربیں لگائی تھیں، ان کی تلافی کی، بلکہ انہوں نے انقلاب کی کامیابیوں کو بھی مختص کیا۔

اسلامی تاریخ میں اس قسم کے دھچکے نے بار بار اپنے آپ کو ایک قاعدہ بننے تک دہرایا ہے - میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک ضروری قاعدہ ہے - کہ انقلاب لازمی طور پر اس کے بچوں کو کھا جاتا ہے۔ لیکن عثمان نے انقلاب کے وفادار بچوں کو ہڑپ ہونے دیا۔ جو لوگ اپنی تلواریں چلاتے اور ایمان، ایثار، قربانی اور استقامت کے ساتھ جہاد کرتے رہے، ان کو ظالموں اور غاصبوں نے اقتدار، حکومت، عوام کے حقوق اور انقلاب کی میراث کو تباہ کر دیا۔ تحریک کے بانی اور عثمان اور ان پر غلبہ پانے والے بنی امیہ کی پہلی قربانی علی (ع) تھے، جو بچ جانے والے انسداد انقلابیوں کے ذریعے زمانہ جاہلیت کے احیاء کا شکار تھے۔ علی کی سیاسی، سماجی اور بین الاقوامی تشکیل ایک نئی جدوجہد کا نمائندہ تھا، قائدین اور نئی اقدار کے وفاداروں کے درمیان جدوجہد، نئے عقیدے کے، جو اسلام کے نئے اور سچے نعروں کے ساتھ اٹھے اور اپنے آپ کو جاہلیت کی حکومت کے احیاء کے لالچ اور بدترین عناصر کا مقابلہ کرتے ہوئے پایا جو ایک نئی مسلط کی گئی تھی۔ ان غاصبوں نے

نئے جوش و خروش کے ساتھ، کھلم کھلا اور خفیہ، اسلامی انقلاب کی عظیم ترین شخصیات کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

پیغمبر ایک ایسے دور کی جدوجہد کا مظہر ہیں جس میں ایک طرف سچے، مومن مسلمانوں نے غیر ملکی دشمنوں کا مقابلہ کیا جو کہ مسلمان دشمن تھے، جبکہ علی اس دور کا مظہر ہیں جس میں ایمان کے نقاب اوڑھے وفادار، وفادار اور تحریک مخالف عناصر کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوئی۔

پیغمبر اور ابو سفیان کے درمیان جدوجہد جس نے ایک موقع پرست کی حیثیت ،سے صرف اس وقت اسلام قبول کیا جب ان کی جماعت کو بالآخر شکست ہوئی یہ ایک بیرونی جدوجہد تھی، جو خالصتاً اور محض دوست اور دشمن کے درمیان تھی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں ابو سفیان کے بیٹے علی اور معاویہ کی لڑائی دوست اور چھدم دوست کے درمیان اندرونی معاملہ تھا یا یوں کہہ لیں کہ اندرونی دشمن'، نظریاتی طور پر تحریک کی حمایت کرتا تھا۔ بیرونی میدان میں' جنگ، بیرونی دشمن کے ساتھ لڑائی کا نتیجہ فتح کی صورت میں نکلا جب کہ اندرونی دشمن کے ساتھ باہمی لڑائی کا خاتمہ شکست پر ہوا۔ یہی وہ چیز ہے جسے اسلامی اصطلاحات میں، قرآن کی زبان میں، 'منافقین' (منافقین) کے طور پر بیان کیا گیا ہے - جو باہر اور باہر ملحد (کافر) یا مشرک (مشرک) سے بھی زیادہ بنیاد اور زیادہ خطرناک ہیں۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیرونی محاذ پر سراسر الحاد و شرک پر اسلامی فتح کا مظہر ہیں جبکہ علی رضی اللہ عنہ نفاق کے ہاتھوں اسلامی صفوں میں شکست کا مظہر ہیں۔

نو جاہلیت' اور 'نو-اشرافیہ' کا مقابلہ کرتے ہوئے، جو اسلام کے سیاق و سباق' میں حق کی آڑ میں اور اسلام کے انصاف کے متلاشی انقلاب کے قلب میں وجود میں آتی ہے، علی مزاحمت کی بنیاد ہے۔ کئی سالوں سے، علی اپنی صفوں میں شرک الٰہی کے خلاف جدوجہد اور جدوجہد کر رہے ہیں، یہ ایک شرک ہے جس نے خود کو توحید (توحید) کا لباس پہنا رکھا ہے۔ اسے اس ملحد سے لڑنا ہے جس

نے اسلام کی چادر سنبھال لی ہے اور جس نے [صفین کی جنگ میں] قرآن کو لانس کی جگہ پر رکھا ہے۔ آخر میں، علی متقی لیکن بے ہوش لوگوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے جو ہمیشہ ایک تیز دشمن کے ہاتھوں آلہ کار بن جاتے ہیں۔

جوں جوں ہم وقت کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں، اسلامی انقلاب کی اصل بنیاد کمزور ہوتی جاتی ہے، جب کہ اس کے مقابلے میں، نو جاہلیت اور اندرونی دشمنوں کی بنیاد مزید مضبوط ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ہم امام حسن (ع) (660ء، 40 ہجری، علی (ع) اور فاطمہ (ع) کے بڑے بیٹے کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں۔

امام حسن علی کی انتظامیہ کے وارث ہیں اور ایک ایسی فوج کے سپہ سالار بنتے ہیں جس میں نفاق نے ترقی کی ہے اور ان کے قریبی دوستوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ ،اس کے بہترین کمانڈنگ افسر خفیہ طور پر امویوں کی سازشوں کے ساتھ پیسے طاقت اور وعدوں کے ٹینڈر کے ساتھ گفت و شنید کرتے ہیں۔ وہ افسران دمشق میں انسانیت اور عزت کے خریدار معاویہ اور اس کے دربار سے اپنی جانوں کا سودا کر رہے ہیں۔ انتظامی نقطہ نظر سے، حسن کو اسلامی ڈومین (شام کا صوبہ) کے سب سے طاقتور، خطرناک اور حساس حصوں میں سے ایک پر کوئی اختیار نہیں ہے جو مکمل طور پر دشمن کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ عراق میں مختلف دھڑے آپس میں اختلاف کا شکار ہیں۔ اشرافیہ علوی حکومت کے وفادار نہیں رہ سکتے۔ عوام غفلت اور بے حسی کا شکار ہیں۔

خضریوں نے، جو عوام میں سب سے زیادہ جنونی اور ایک خطرناک طاقت میں سے ہیں، امام حسن کا مقابلہ کیا جو نئی اسلامی تحریک کے سب سے عزیز، سب سے زیادہ باخبر اور ترقی پسند ساتھیوں کی آخری جدوجہد کا مظہر ہیں۔ اندرونی دشمنوں کی منافقت کی صفیں روز بروز مضبوط ہوتی جارہی ہیں یہاں تک کہ اشرافیہ کے اسلام کے خلاف انصاف کے اسلام کے دفاع کی آخری جدوجہد کے اذیت ناک اور تباہ کن لمحے تک۔ واحد متبادل امن قائم کرنا ہے۔ اسے شکست

ہوئی ہے۔ شکست خوردہ فریق امن معاہدے کی شرائط کی وضاحت نہیں کرتا۔ وہ اس پر مسلط ہیں۔ حسن ٹوٹ گیا۔

اس طرح حسن، جو انقلاب کی جدوجہد کی روح کا رہنما اور مظہر ہے، دوبارہ بیدار ہوئی نو جہالت کے خلاف مزاحمت میں بیٹھا ہے۔ وہ غیر مسلح ہے اور ایک عام سپاہی کی طرح جب ہم امام اور لوگوں کے رہنما کے گھر کے اندر دیکھتے ہیں، ٹرن کوٹ اور اموی جاسوس، جو اس کے ساتھ روٹی توڑتے تھے، اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اس کی بیوی کو بھی خرید لیا اور اس کے ذریعے حسن کو زہر دے دیا۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انصاف، آزادی اور عوام کس حد تک کمزور ہو چکے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچتی ہے کہ ایک ایسی قوت کے قائد امام حسنؑ کی طاقت جو آج بھی مزاحمت اور اسلام کے نام کا دفاع کر رہی ہے، اس قدر کم ہو چکی ہے کہ جب وہ فوت ہو جاتے ہیں تو انہیں مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن نہیں کیا جا سکتا، جو ان کے دادا، والد اور والدہ اور ان کے خاندان کا شہر ہے، مہاجرین اور پیغمبر اسلام کا شہر ہے۔ امام حسن بقیع کے عوامی قبرستان میں مدفون ہیں۔

امام حسن، اسلامی معاشرے میں تنہائی اور تنہائی کا مظہر، حتیٰ کہ مدینہ منورہ میں بھی، واضح طور پر بتاتا ہے کہ اسلام میں حق کی متلاشی جماعت کس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ انقلاب کی نئی قوت ہر ایک چیز پر پوری طرح حاوی ہو جاتی ہے اور ہر میدان میں فتح حاصل کر لیتی ہے۔ اب حسین کی باری ہے۔

امام حسین

حسین کو اسلامی تحریک وراثت میں ملی۔ وہ اس تحریک کا وارث ہے جسے محمد نے شروع کیا، علی نے جاری رکھا اور جس کے دفاع میں حسن آخری دفاع کرتا ہے۔ اب حسین کے لیے وراثت کے لیے کچھ نہیں بچا، نہ فوج، نہ اسلحہ، نہ دولت، نہ طاقت، حتیٰ کہ منظم پیروکار بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

اب یہ تقریباً 60 ہجری (680ء) ہے، جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس سال بعد ہے۔ ہر امام اپنی جدوجہد کی شکل اختیار کرتا ہے۔ براہ کرم یہاں سے اس طرف خصوصی توجہ دیں جس کا میں اظہار کرنے کی (کوشش کر رہا ہوں۔ یہیں سے میں اپنے اصل نکتے پر پہنچ رہا ہوں۔

ہر امام اور ہر رہنما کی جدوجہد کی شکل ان کے ذاتی ذوق پر مبنی نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے حالات کے مطابق شکل اختیار کرنی ہوتی ہے، دھڑے بندیوں اور دشمن کی طاقت اور تشکیل کی نوعیت کا اندازہ لگانا ہوتا ہے۔

اس طرح حسین نے جس جدوجہد کا انتخاب کیا اس کی شکل کو ان حالات کی نوعیت کو مدنظر رکھے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا جن میں حسین اپنی مخصوص بغاوت شروع کرتا ہے۔ اب جب حسین کی باری آتی ہے تو زمانہ اور عوام ایک آدمی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ کتنا مشکل ہوتا ہے جب ایسی صورت ،حال پیدا ہوتی ہے—بعض اوقات کسی قوم کی تقدیر، کسی عقیدے، کسی نظریے کسی معاشرے، ایک نسل کی تقدیر کسی فرد یا کئی افراد کی طرف اس توقع میں ہوتی ہے کہ وہ کیسے عمل کریں گے۔

اب انقلاب کی حفاظت کی ذمہ داری حسین کے کندھوں پر اس وقت آن پڑی ہے ،جب مزاحمت کے آخری گڑھ ختم ہو چکے ہیں۔ اس کے لیے اپنے دادا، والد، بھائی اسلامی حکومت یا جماعت حق و انصاف کی طاقت سے اس کے لیے کچھ نہیں بچا، نہ کوئی تلوار، نہ ایک سپاہی۔

بنی امیہ نے معاشرے کی ہر بنیاد پر قبضہ کر رکھا ہے۔ قریش نے برسوں تک اپنی ناواقفیت میں اقدار پر غلبہ حاصل کیا اور اسلامی انقلاب کے ثمرات کا غلط استعمال کیا۔ اسلامی انقلاب کو ایک دوسرے سے جدا ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں اور انقلاب کے ساتھی اور ابتدائی جدوجہد کرنے والے، مکتب محمد کے شاگرد تین گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ پہلا گروہ، جس نے تحریک کی کج روی کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے مقصد کے لیے کھڑے ہو کر جان دے دی، 60 ہجری

،تک سب غائب ہو گئے۔ ابوذر اب نہیں رہے۔ عمار، عبداللہ بن مسعود، میثم حجر ابن عدی سب کا انتقال ہو چکا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو خاموش کونے میں پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ وہ مشکل وقت میں اپنے آپ کو نماز اور عبادات میں مصروف رکھتے ہیں جو خود قربانی کی شکل میں عبادت مانگتے ہیں جس میں سچے مسلمانوں نے نہ تو فتح حاصل کی ہے اور نہ ہی شہادت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ جیل میں اذیتیں دی گئی ہیں۔
انہوں نے دوسرا راستہ تلاش کیا ہے۔ میدانِ جنگ میں جہاد کی صفوں میں جنت ،کی تلاش کے بجائے، وہ اس کے لیے اعتکاف میں اعتکاف اور عشقِ الٰہی کے مراقبہ طویل روزے اور عزاداری، خود شناسی اور عبادات میں اعتکاف کرتے ہیں۔ اس گروہ کی سب سے بڑی مثال عبداللہ بن عمر ہے۔

یہ عظیم ہستیاں وہ ہیں جو زمانہ ٔزمانہ میں امت مسلمہ کو کوڑوں سے کوڑے اور امویوں کے کارندوں کی تلواروں سے مارے جا رہے ہیں، جو ان کے اٹھنے اور مزاحمت کی طرف دیکھ رہے ہیں- وہ لوگ جنہوں نے انقلاب اسلامی میں پرورش پائی اور جدوجہد کی تھی- وہ لمحہ فکریہ ہے جب انہوں نے پیغمبر کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر میدان عمل میں لایا تھا۔ لڑائی، وہ خاموشی کے عالم میں مسجدوں کے کونے کونے تک پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

وہ کون سی بہترین مسلمان شخصیتیں ہیں جن کی قربانی دی جاتی ہے جبکہ دیندار ظلم اور کفر کے کارندوں سے پسپائی اختیار کرتے ہیں؟ ہاں وہ لوگ جو ایسے وقت میں میدان جنگ چھوڑ کر معاشرے سے دور مسجد کے طاق میں آ گئے۔ ان کے ہاتھ جرائم سے آلودہ ہیں، پاک دل ہیروز کے خون سے آلودہ ہیں اور یہاں تک کہ ان کے اپنے خون سے بھی آلودہ ہیں۔

باشعور انسان اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے اور صحیح اور غلط میں فرق کو پہچانتا ہے۔ اگر وہ تنہائی میں ریٹائر ہو جائے تو گویا اس نے ظالم کے فائدے کے لیے مذہبی اور روحانی جدوجہد میں مصروف ایک آزاد اور باشعور مجاہد کو براہ

راست قربان کر دیا ہے۔ یہ قربانی خود بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک مجرم ہے جو جرم کرتا ہے چاہے وہ بغیر تنخواہ کے ہو یا بلیک میل کے ذریعے۔ وہ ایمان کے بہترین عناصر کو کفر کے حق میں قربان کرتا ہے۔ یہ بدترین عناصر ہیں۔ ظالم کے قدموں میں گر کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

تیسرا گروہ وہ صحابہ ہیں جنہوں نے پوری بیداری کے ساتھ میدان جنگ کو ترک کر دیا تھا۔ وہ اس دستے میں سے ہیں جس نے بدر، احد اور حنین میں جہاد کیا اور مدینہ منورہ اور پیغمبر اسلام کی ہجرت اور پیغمبر اسلام کے شانہ بشانہ ان عزتوں کو بیچ ڈالا جو انہوں نے سیدھے معاویہ کے سبز محل میں جمع کیے تھے۔ انہوں نے اپنی رقم ایک دینار فی روایت کے حساب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کہے اور کیے کے حساب کتاب بیچ کر جمع کی۔ ان لوگوں میں ابو درداس، ابو ہریرہ اور ابو موسیٰ شامل تھے۔ ابو ہریرہ ایک صحابی ہونے کے ناطے جو ہمیشہ پیغمبر اسلام کے ساتھ رہتے تھے، وہ صحابی کے طور پر جانا جاتا تھا جو علم حدیث (روایات سے متعلق) میں مہارت رکھتا تھا۔ اُمّی دربار میں اُس نے اتنی شہرت حاصل کی تھی کہ یزید (معاویہ کا بیٹا اور خلیفہ کے جانشین) نے اُسے عبداللہ بن سلام کی بیوی اورینب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کام پر رکھا۔

اب آپ سوچیں گے کہ نوجوان ایسی صورت حال سے کیا سوچتے ہیں؟ یہاں حسین کا زمانہ ہے۔ یہ انقلاب کے بعد صرف دوسری نسل ہے: ایک ایسی نسل پروان چڑھی ہے جس نے اس شاندار وقت، ان قیمتی فتوحات، جوش اور محبت کا تجربہ نہیں کیا جیسا کہ صحابہ کرام میں تھا۔ ان میں سے ایک صحابی کی زبان سے ایسی باتیں سن کر نوجوانوں کے دلوں سے محبت نکل گئی۔ ان کی تمام امیدیں، ایمان، خیالات انقلاب میں تربیت پانے والے صحابہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

جب وہ ہر روز اپنے ہیرو میں سے کسی کو گرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو کیا مایوسی ہوتی ہے، ایمان کی کیا کمی ہوتی ہے اس چیز میں ان کا تجربہ ہونا چاہیے جسے وہ

اسلام کہتے ہیں۔ یہ صحابہ کا حشر ہے، کل کی نسل، نبی کے دور کی نسل، انقلاب کا دور۔

لیکن دوسری نسل، جو جوش، ولولے اور جذبے سے بھر پور سامنے آتی ہے، خواہ وہ ،تجربہ کار ہو یا نہ ہو، نو جہالت کے حکم کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار ہے اس کے باوجود کیا ہو رہا ہے۔ انقلاب کی دوسری نسل کا مظہر اور رہنما حجر ابن عدی ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں حجر اسود چھوٹے تھے۔ وہ علی کے وقت جوان ہو چکے تھے اور پھر حسن کے وقت میدان میں اترے۔ اس میں سیاستدان جیسی خوبیاں ہیں۔ وہ ذمہ دار اور باشعور مجاہد ہے۔ امام حسن اور معاویہ کے درمیان صلح کے وقت، وہ امام حسن کے معاہدے پر دستخط کرنے کے سخت ترین اور سخت مخالفوں میں سے ایک تھے۔ یہاں تک کہ وہ امام کو گالیاں دینے کے لیے یہاں تک چلا گیا تھا کہ ’’تم نے ایسا کر کے واقعی !لوگوں کی تذلیل کی ہے

وہ ایک پرجوش اور ولولہ انگیز انقلابی ہے لیکن امام حسن اسے مدینہ میں ایک طرف لے جاتے ہیں اور خاموشی سے اسے قائل کرتے ہیں اور جدوجہد کے مستقبل کے بارے میں پرامید بھی کرتے ہیں۔

تاریخ میں اس گفتگو کا کوئی واضح بیان نہیں ملتا۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہوجر اطمینان کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ ہوجر کوئی قابل اعتماد شخص نہیں ہے اور نہ ہی وہ کوئی قدامت پسندانہ طرز عمل کو قبول کرنے والا ہے جس میں سمجھوتہ یا تفرقہ بازی کی منطق، غیر فعال برداشت یا جدوجہد کے لیے غیر خطرناک نقطہ نظر شامل ہو۔ نہ ہی وہ قیادت کا ایسا بت پرست ہے کہ امام حسن کی رائے کو بغیر سوال کے قبول کر لیتا ہے۔

طحہ حسین [مشہور مصری مصنف] حجر اور امام حسن کی اس ملاقات کے ساتھ ساتھ سلیمان بن سورادی خزاعی اور امام کے ساتھ ایک اور ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جیسا کہ وہ بتاتا ہے، سلیمان بھی ایک اچھے اور پرامن

سمجھوتے پر بہت تنقید کرتا ہے، پھر بھی ہوجر کی طرح امام حسن کے استدلال سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ طحہٰ حسین کہتے ہیں کہ امام حسن کی دلیل اس طرح چلی ہوگی: کسی بھی قسم کی کھلی فوجی جدوجہد جیسے میدان میں لشکر چڑھانے کا کوئی مقصد نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ وہ جو بھی قوتیں چھوڑ گئے اسے ختم کردیں۔ انہوں نے زیر زمین جدوجہد کو مؤثر طریقے سے جاری رکھنے کے لیے خفیہ تنظیم کی بنیاد قائم کرنے کی بات کی تھی۔ حکومت کے خلاف مزاحمتی تحریک یا انقلابی آپریشن کی شکل اختیار کر لی۔ یہی وہ تنظیم ہے جس نے آخری شیعہ امام (ع) تک بنی امیہ اور عباسیوں کی دو خلافتوں کے دوران ایسے نیٹ ورکس بنائے جو پوری سرزمین اسلام میں پھیل گئے اور شیعہ مزاحمتی تحریک کو بنیاد فراہم کی۔

حضر اور ان کے ساتھی جو کہ علی ابن حاتم جیسے پرجوش جوان ہیں، ظلم و جبر، استبدادی، عوام کے استحصال اور ان کے حقوق اور اسلامی تحریک کے انسانی مقاصد کو منتشر کرنے کے دور کے جبر اور سیاہ آمریت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کا اصرار ہے کہ عوام پر اس بگڑی ہوئی حکمرانی کو ٹال دیا جائے جو حق، انصاف اور اسلام کی قیمت پر روز بروز مضبوط ہو رہی ہے۔

ہجر کی قیادت میں جدوجہد اس وقت تک بڑھتی گئی اور مزید زور پکڑتی گئی جب تک کہ امویوں نے ایک مذموم سازش کے ذریعے ہجر کے خلاف ایک حکم نامہ جاری کر دیا جس میں اسے ملحد قرار دیا گیا (اور یہ امویوں کی پسند کی طرف سے آیا ہے!)۔ پھر تحریک کی دوسری نسل کے مزاحمتی جوانوں کو شام میں دمشق کے قیام کے خلاف بغاوت کی پاداش میں گرفتار کر کے پھانسی دے دی جاتی ہے، یہ مکتب اور راہِ علی کے شاگرد جنہوں نے وفاداری کے ساتھ اپنی مزاحمت پر ثابت قدم رکھا۔

اب حسین ظاہر ہوتا ہے لیکن انقلاب کی طاقت کا مرکزی مرکز کھو چکا ہے۔ مزاحمتی جدوجہد کے ساتھی یا تو مارے جا چکے ہیں یا خاموش کر دیے گئے ہیں۔

وہ وفادار صحابہ جنہوں نے اپنے آپ کو فروخت نہیں کیا تھا، لوگوں کو آزادی دلانے اور ان کے جابرانہ تسلط سے نجات دلانے کے لیے حق کے لیے لڑنے اور سماجی اور سیاسی جدوجہد میں شامل خطرات سے پریشان ہونے کے بجائے راہ کے گوشے میں عقیدت کی حفاظت تلاش کی۔ وہ عزت، پرہیزگاری، خود پسندی کے خول میں پھسل چکے ہیں اور خاموش ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے قابل ذکر صحابہ کا ایک گروہ، معاویہ کے سبز محل میں اپنا وقت سرکاری خزانے کی مدد میں گزار رہا ہے جب کہ دوسری نسل امویوں کے خلاف جدوجہد اور جدوجہد میں شکست کھا چکی ہے۔ ظالم کی طاقت، تلوار سے یا پیسے کے ساتھ یا عہدے سے یا دھوکے سے، ہر ایک پر خاموشی کا طمانچہ لاتی ہے۔

خوف، پیسے اور دھوکہ دہی کے دباؤ اور لائسنس اور بدعنوانی کی آزادی کے ساتھ ساتھ خیالات اور ایمان کے جبر اور احساس ذمہ داری کے ساتھ نو-اسراریت کا طریقہ کار کام کرتا ہے۔ اس طرح حکومت معاشرے کے اخلاقی ریشے کو زوال کا باعث بنتی ہے۔ وہ اصل بنیادوں، ایمان کی سچائی، انقلاب، تحریک اور اسلام کی بنیادوں پر بمباری کرتے ہیں اور انہیں مٹا دیتے ہیں۔ وہ خاموشی کی چالاک اپیلیں کر کے دلوں اور دماغوں کو مفلوج کر دیتے ہیں۔

نو جاہلیت کی حکومت اچھی طرح جانتی ہے کہ انقلاب کا خطرہ آل محمد کو تباہ کرنے یا علی کے قتل یا حسن کی فوج کو شکست دینے یا خود حسن کی خفیہ اور غیر انسانی تباہی سے نہیں آئے گا۔ یہ جانتا ہے کہ مزاحمت کے ہر اڈے کو اکھاڑ پھینکنا یا تمام غیر یقینی قوتوں کا بکھر جانا، کوفہ میں نوجوان نسل کی بغاوت کی شعلہ انگیز شخصیتوں کا بے رحمانہ قتل عام جیسے ہجر؛ جلاوطنی، قتل یا غربت کی مذمت اور ان حقوق سے کٹوتی جن کے لیے ابوذر جیسے صحابہ نے ایمان کی شاندار طاقت سے جدوجہد کی، بے معنی ہے۔

یہ محسوس کرتا ہے کہ وسعت، آگہی کی عمدہ حساسیت، حق پر ایمان کی ،گہری کنارہ، اسلام کی روح کی گہری سمجھ، دعوت کے راستے کی صحیح معرفت

رسول کے مشن کی حقیقی معنویت کو وحشیانہ طاقت، جارحیت، بے حسی اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے استقامت کے ذریعے دبایا نہیں جا سکتا۔ یہاں تک کہ عبداللہ ابن مسعود جیسے بہادر جانوں کا قتل، جو ناانصافی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور تشدد کا نشانہ بنے، انصاف کی جنگ میں ہر رکاوٹ کو برابر کرنے، نظام حکمران کے خلاف مزاحمت کی ہر صلاحیت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ، اور مجموعی طور پر، حقیقی معنوں میں خدمت کرنے والوں کی شہادت اور خدمت کرنے والے حقیقی قائدین کی شہادت بھی بے سود ہے۔ جدوجہد وہ ،سب سے اہم آدمیوں اور عظیم ترین صلاحیتوں کو اپنی خدمت میں لیتے ہیں تمام کوششوں کو کچل دیتے ہیں، تمام محاذوں پر فتح حاصل کرتے ہیں اور شام سے خراسان تک پھیلی ہوئی تمام سرزمین اسلام پر اموی بادشاہت کا مکمل تسلط قائم کرتے ہیں۔ اس سب کے ساتھ، مزاحمت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ وہ اپنی حکومت کے استحکام کی کتنی ہی ضمانت دینا ،چاہتے ہیں اور انہیں آزاد ہاتھ سے حکومت کرنے کی اجازت دینا چاہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام کوششیں فتح، تسلط حاصل کرنا، قیادت کی باگ ڈور پر قبضہ کرنا، عوامی آزادی کے محاذ کو توڑنا، تمام عقیدے کے محافظوں، آزادی کے چاہنے والوں، حقوق کے متلاشیوں کو بکھرنا اور کچلنا، انصاف کو غیر مسلح کرنا، ہتھیار ڈالنا اور آخرکار ہتھیار ڈالنا۔ اسلام اور لوگوں کو اپنے تسلط کی زد میں لانے کی یہ تمام کوششیں رائیگاں نہیں جاتیں۔

بنی امیہ کے ذہین، باشعور، سیاست دان اپنے آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ اپنے ،لوگوں اور زمانے کی روح کو جانتے ہیں۔ یہ معاشرہ اسلام کے عظیم فکری، سماجی سیاسی، روحانی انقلاب کی پیدائش سے صرف ایک نسل دور ہے۔ ایک نقطہ نظر سے یہ حکومت جہالت و شرک اور بدر، اُحد اور خندق کی لڑائیوں سے ایک نسل دور ہے، ان تمام ملحد، مشرک، غلامانہ اور سرمایہ دارانہ گروہ کے سرداروں کا زمانہ ہے جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کی تھی۔

اموی جانتے ہیں کہ شکست کی سیاہ راکھ کے نیچے ایک ممکنہ دھماکے کے سرخ خطرے کو سلگایا جاتا ہے۔ فوج کو شکست ہو چکی ہو گی لیکن اسلام اب بھی بہت زندہ ہے۔ عقیدہ کی جماعت منتشر ہو چکی ہے لیکن خود ایمان بہت زندہ ہے۔ انصاف کے رہنما اور حق کے حامی، آزادی اور انسانیت کے ہتھیار اور ڈھال سب تباہ ہو چکے ہیں۔ آزادی کی رکاوٹ کو گرا دیا گیا ہے اور مزاحمت کی بنیاد کو تباہ کر دیا گیا ہے۔

لیکن انصاف کی وجہ، حق کی پرستش، آزادی کا ذائقہ اور انسانیت سے محبت کا کیا ہوگا؟ علی نماز میں مارے جاتے ہیں لیکن علی کی آگ کا کیا ہوگا؟ ابو ذر کو جلاوطن کر دیا گیا، پھر رابضہ میں موت نے خاموش کر دیا، لیکن ابو ذر کی چیخ پکار کا کیا ہوگا؟ شام میں ہجر کو پھانسی دی جاتی ہے، پھر بھی ہجر کی بغاوت کا کیا؟

ان خطرات کا اصل مرکز، ان بغاوتوں کا چشمہ مدینہ میں نہیں ہے جہاں لوگوں کا قتل عام کیا جاتا ہے، نہ کعبہ میں جہاں لوگوں کو سنگسار کیا جاتا ہے، نہ کوفہ میں جہاں بغاوت کا راج ہے، نہ مسجد نبوی میں جہاں لوگوں کو گھوڑوں کے پیروں تلے روند دیا جاتا ہے اور سواروں نے کاٹ دیا ہے، اور نہ ہی نبی کے گھر میں اور نہ ہی گھر والوں میں۔ فاطمہ جو اب راکھ ہے، نہ قرآن میں جسے وہ نیزوں سے چھیدتے ہیں۔

پھر آگ کا دل کہاں ہے، خطرے کی مسلسل بہار کہاں ہے؟

یہ دلوں اور دماغوں میں ہے! اگر ان دونوں ذرائع کو تباہ نہ کیا جائے تو تمام فتوحات بے اثر رہیں گی اور تمام قوتیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ اگر یہ دونوں زندہ رہیں تو ابوذر، حجر، عمر اور ملک جیسے تمام لوگ بھی اپنی شہادت میں زندہ رہیں گے اور نئے لوگوں کو میدان جنگ میں بھیجیں گے۔ تمام علی موت سے پہلے شہادت کو پہنچیں گے اور زندگی میں مریں گے۔ لیکن اگر اس کے مکتبہ فکر

کی آگ کو ختم نہیں کیا جاتا ہے تو، بڑے پیمانے پر جلادوں کے ذریعہ کوئی بھی استثنیٰ، چاہے سیاہ ہو یا سرخ، برقرار نہیں رہ سکتا۔

وہ خون کے سمندر اور موت کے قبرستان میں ایک لمحے کے لیے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔

الہی انقلاب کا مشن قرآن میں نہیں ہے، یہ یہاں ہے۔ اگرچہ علی کو کوفہ مسجد میں قتل کر دیا گیا ہے، وہ اب بھی موجود ہے۔ جتنے بھی مارے گئے، جتنے بھی فتح ہوئے، جتنے بھی مورچے ہارے، جتنے ہتھیار اور قلعے چھین لیے گئے، سب حق آزادی اور انصاف کے تھے۔ سچائی، آزادی (آزادی) اور انصاف کے حصول کی جدوجہد اب بھی موجود ہے اور وہ ان دو بنیادی اصولوں پر کام کرنے میں مصروف ہیں۔ اس لیے ان دونوں مراکز کو تباہ کر دیا جائے۔ اگر یہ دو آگ دینے والی، نورانی قوتیں اور تحریک پیدا کرنے والے مراکز تباہ ہو جائیں تو یہ باقی رہ کر ایک گھونسلا بنا سکتے ہیں۔

حملے شروع ہو جاتے ہیں۔ خطرے کے دو ذرائع، دھماکے اور آگ کے دو حقیقی ذرائع یعنی دل اور دماغ کو تباہ کرنے کے لیے ہتھیار جمع کیے گئے ہیں۔

لیکن اس جنگ کے لیے ایک اور قسم کے ہتھیار، ڈھال، کمان اور تیر اور دوسری قسم کی فوج، پالیسی، ڈیزائن، منصوبہ، حکمرانوں اور فاتحوں کی ضرورت ہے۔ اس لشکر اور حملے کی قیادت میں نہ سونا کارگر ہے، نہ رے یا عراق کو حکومت کرنے کے حقوق دینے میں، نہ تدبیریں، نہ عمرو کی ذہانت اور نہ ہی بسر بن ارت یزید ابن محلب اور حجاج ابن یوسف کے کارنامے اور قتل۔

اس سرپرائز حملے میں قرآن ہتھیار ہیں، سنت رسولؐ ڈھال ہیں۔ فکر اور سائنس سامان ہے، ایمان قلعہ ہے، اسلام پرچم ہے اور فوج مفسرین، استحصال کرنے والوں، لیکچررز، مذہبی ماہرین، علماء، ججوں اور رہنما پر مشتمل ہے۔ قائدین عظیم صحابی رسول، اہم پادری اور عظیم مفتی ہیں۔

حملہ شروع ہوتا ہے۔ دین کی فوج اس سرزمین پر آسانی اور کامیابی کے ساتھ ترقی کرتی ہے جہاں ایک دنیاوی، زمینی فوج پہلے ہی ترقی کر چکی تھی اور کسی بھی رکاوٹ اور مزاحمت کو ختم کر چکی تھی۔ اس طرح، وہ آگ کے دو اہم مراکز میں داخل ہوتے ہیں، ترقی کرتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں، دھیرے دھیرے ان پر فتح پاتے ہیں، اور بغیر کسی نمایاں مزاحمت کے، ایک خوفناک کمپاؤنڈ کے ساتھ اندر سے انہیں برباد کر دیتے ہیں۔ وہ ایک امرت استعمال کرتے ہیں، جس کو بنانا تمام مذاہب کے رسمی پادری بخوبی جانتے ہیں۔ وہ اس کی ترکیب کو پوری تاریخ میں ایک دوسرے کو منتقل کرتے ہیں۔ یہ وہی ناشائستہ امرت ہے جس سے موسیٰ کو فرعون، قارون کو ختم کرنے کا اختیار دیا گیا اور یہودیوں کو، جو فرعون سے زیادہ قاتل، قارون سے زیادہ دولت کے پوجا کرنے والے اور بلعم سے زیادہ دھوکے باز اور امن کے عاشق اور بانی حضرت عیسیٰ مسیح سے، شیطانی اعمال اور دین سے نفرت کے ساتھ قیصر بنا۔

دانشور بک جاتا ہے اور پادریوں کا تعلق طاقتور سے ہے۔ اسلام میں موضوع شروع ہوتا ہے جو ہر چیز کی تقدیر بدل دیتا ہے۔ تمام اقدار فنا ہو چکی ہیں۔ وہ روح کو مار ڈالتے ہیں، اسلامی انقلاب کی سمت بدلتے ہیں اور آخر میں مذہب کے نام پر لوگوں کو قربان کر دیتے ہیں۔

یہ پہلا موقع ہے کہ اسلام، علمائے کرام کی مدد سے، حکومت کے عناصر اور اعمال کی گواہی دیتا ہے۔ مذہبی حکام مجبوری سے یقین رکھتے ہیں کہ ہر چیز کا تعلق خدا سے ہونا چاہیے۔ دو خوفناک کینسر لوگوں پر گرتے ہیں "خدا کے نام پر" اور خدا کا مذہب"۔"

پہلا مذہبی حکام کا کینسر ہے۔

وہ چھدم اسلامی علماء اور پادری ہیں۔ وہ اسلام کے بولنے والے، مذہبی اسکالرز اور کمیونٹی کے رہنما ہیں۔ ان کا کوئی سرکاری عہدہ یا صورتحال نہیں ہے۔ وہ قاتل

نہیں ہیں۔ وہ اسکولوں کے کونے کونے میں پڑھتے ہیں، سیکھتے ہیں اور سکھاتے ہیں۔ مذہبی حکام (مرجع) کون ہیں؟ مذہبی اتھارٹی کا کیا مطلب ہے؟

ان کا مقالہ یہ ہے کہ کوئی بھی، گناہ گار یا پاکیزہ، جس نے بھی کوئی غلط کام کیا ہے، دھوکہ دہی کی ہے، کوئی سازش کی ہے یا کوئی جرم کیا ہے، اسے خدا کی رحمت اور بخشش کی امید رکھنی چاہیے۔ اُس کو اُمید ضرور ہونی چاہیے کیونکہ خُدا نے کہا ہے، ’’ایسے لوگ ہیں جو خُدا کے حکم پر اُمید رکھتے ہیں۔‘‘ یہ امید ہے کہ خدا کی بخشش، رحم اور شفقت کی اجازت دیتا ہے. خدا معاف کرتا ہے اور امید ہے کہ وہ کسی بھی جرم کو معاف کر دے گا۔ لہٰذا کسی بھی عام آدمی کے لیے جو خود گناہ گار ہو ایسے مجرموں کو برے ناموں سے پکارنا حرام ہے۔ آپ انہیں برے ناموں سے نہیں پکار سکتے اور ان سے لڑ نہیں سکتے۔

دوسری طرف جب آپ کسی مجرم، جابر اور سازشی کو کہتے ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف کسی کو مظلوم یا غلام کہتے ہیں تو گویا آپ خدا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کیونکہ خدا ہی حاکم اعلیٰ ہے اور اسی بنیاد پر خدا ہر ایک کے اعمال کو حساب میں لیتا ہے اور جو بھی انصاف کے میزان کے خلاف ہو اس کے طریقہ کار اور طرز عمل کا فیصلہ کرتا ہے۔ لہذا، آپ کو ظالم اور سازشی کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے. آپ یہاں انصاف کے ترازو کی میزان قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ خدا ہیں؟ کیا آپ لوگوں پر الزام لگانا چاہتے ہیں اور خدا سے پہلے ان کا حساب کتاب صاف کرنا چاہتے ہیں؟ نہیں، سازش کرنے والے اور سرور کے درمیان فیصلہ کرنا ہمارا فرض نہیں ہے۔ ہمیں مجرم کی مذمت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں اس یا اس گروہ کے خلاف کھڑے ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں ان سب کو قبول کرنا چاہیے۔ ہمیں صبر کرنا چاہیے اور ہر ایک کی سزا اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو مذہبی حکام سے پیدا ہوتا ہے "کہ وہ کہتے ہیں کہ "سب کچھ خدا پر چھوڑ دو۔

مذہبی حکام کی امید یا کینسر کی یہ بیماری اسلام کی دوسری نسل کو مفلوج کر دیتی ہے، جنہوں نے مکتبِ اسلام میں خاطر خواہ تربیت حاصل نہیں کی اور جنہوں نے قرآن اور اسلام کی زبان پیغمبر، علی، مہاجرین اور مددگاروں کی زبان سے حاصل نہیں کی۔ اس طرح وہ اپنے اسلامی کو حاصل کرنے کے پابند ہیں۔ ان لوگوں سے دوسرے ہاتھ کی تعلیمات جنہوں نے اپنے خیالات اور نظریات کو بیچ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیداری، نتائج اور مذہبی روحیں مستقل طور پر حکمران حکومت کے حمایت یافتہ مذہبی حکام کے پروپیگنڈے سے زہر آلود ہو جاتی ہیں۔ یہ سخت، ذمہ دار بنیاد پرست مسلمان ہیں، جو ہر لمحہ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں کہ 'اچھی بات کا حکم دیں اور برے سے منع کریں' (امر بل معروف و نہی انیل منکر)، موٹے سر والے لوگ جو خدا اور شیطان دونوں میں شامل ہو کر اپنے آپ کو پھیلاتے ہیں، جن میں سے ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسرا کینسر تقدیر کا کینسر ہے جو اس دور میں بھی بڑھتا ہے۔ پہلا مذہبی مکتبہ فکر جو بنی امیہ کے دور میں بنایا گیا وہ مذہبی حکام کا مکتب ہے۔ وہ ،قرآن کو تمام نظریات اور عقائد کو مفلوج اور تباہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں بہت کم جہاد۔ دوسرا مکتب تقدیر ہے جو فلسفے کا پہلا مکتبہ ہے جو عمی دور میں ایک الہی فلسفہ کے طور پر وجود میں آیا۔

ہم دیکھیں گے کہ مقدس اور مقدس چہروں کے پیچھے کیا کرپشن چھپی ہے۔ الہی تقدیر کا مطلب ہے، جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے، "خدا مطلق حاکم ہے"۔ وہ اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ کائنات میں جو بھی مصیبتیں آتی ہیں وہ اس کی مرضی کے مطابق ہیں۔ جو کچھ بھی کرتا ہے اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ کسی کے پاس جو بھی مقام ہو، جس حال میں بھی ہو، جو بھی انتخاب ہو، جو بھی اقدام کرتا ہے، چاہے وہ بدعنوان ہو یا خالص، قاتل ہو یا غیر قاتل، سزائے موت پانے والا ہو یا جلاد، خدا کی مرضی اور عزم کے خلاف ردعمل۔ چاہے کوئی

غلام ہو یا آقا، سب حاکم ہیں یا حاکم اللہ کے ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے جو طاقت دیتا ہے اور چھین لیتا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو مارتا اور وجود میں لاتا ہے۔ عزت یا ذلت دینے والا خدا ہے۔ کسی کو کوئی حق نہیں۔

تقدیر کی اس وضاحت کی درستگی یا کشش کا ان وفادار مسلمانوں پر زبردست اثر ہوا جنھوں نے قرآنی الفاظ کو روایات نبوی کی روایتوں کے ساتھ مل کر خود بخود ابوہریرہ جیسے لوگوں کے ذریعہ 'روایت سازی کی مشینوں' میں تیار کیا یہاں تک کہ وہ نبی کے نام پر 40,000 مختلف روایات تک پہنچ گئے۔ ان سب کے کہنے کے لیے پیغمبر کو 1000 سال زندہ رہنا پڑتا۔

علماء کی ان تعلیمات کا ان مسلمانوں کے افکار پر مفلوج کرنے والا اثر پڑتا ہے جو خدا کی مرضی کی اطاعت میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ بنی امیہ اس لیے حکومت کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ اختیار دیا تھا۔ اگر علی کو شکست ہوئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے ان کو شکست دی تھی۔ چاہے کوئی برا ہو یا اچھا، اگر اچھا فنا ہو جائے اور برے، حکمرانی کریں، یہ سب ایک اعلیٰ حکمت پر مبنی ہے جو ہم پر واضح نہیں ہے لیکن خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ یہ ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ لہٰذا، کسی بھی عہدے یا شخص کی بے ادبی، جرم یا لوٹ مار کو خدا کی مرضی، طاقت اور عزم پر احتجاج اور تنقید سمجھا جاتا ہے۔

ہجرتِ نبوی کو ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ انقلاب کی کمائی ہوئی ہر چیز تباہ ہو گئی۔ نصف صدی پہلے حاصل کی گئی تمام کامیابیاں ختم کر دی گئی ہیں۔ نبی کی لائی ہوئی کتاب بنی امیہ کے نیزوں پر رکھی ہوئی ہے۔ اسلام نے جہاد، جدوجہد اور کوششوں سے جو ثقافت اور افکار لوگوں کے دلوں اور افکار میں پروان چڑھائے ،وہ اموی حکومت کی وضاحت کا ذریعہ بن گئے۔ تمام مساجد کو شرک، ظلم فریب اور عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے امدادی نظام بنا دیا گیا ہے۔ مجاہدوں کی تمام تلواریں جلاد کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ زکوٰۃ اور دیگر مذہبی ٹیکسوں سے

حاصل ہونے والی تمام آمدنی معاویہ کے سبز محل کو چلانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ حقیقت، توحید، پیغمبر، سنت، قرآن اور وحی سے متعلق تمام الفاظ معاویہ ،اور ان کی حکومت کے پاس ہیں۔ کمیونٹی کے تمام رہنما، قاضی، مفسر قرآن تلاوت قرآن کرنے والے، علماء اور مساجد کے مقررین یا تو مارے جا چکے ہیں یا مساجد کے کونے کونے میں خاموشی سے نماز ادا کر رہے ہیں یا پھر دمشق (یعنی بنی امیہ) کی حکومت کا پرچار کرنے والے ہیں۔

محمد کی بنیادوں کا اب کوئی ترجمان نہیں، نہ قربان گاہ اور نہ ہی منبر۔ اس پورے علاقے میں جس میں روم، ایران اور عرب شامل تھے، کوئی بھی ایسا شخص باقی نہیں بچا ہے جس کا تعلق پیغمبر کے خاندان سے ہو یا جو انقلاب کے وفاداروں کی نسل میں سے تھا۔ مہاجرین اور صحابہ کے تمام مصائب کا نتیجہ ہوا کے ساتھ نکلا۔ معاویہ کے محل کو ایک خزانہ ملا، آسانی سے کمایا۔

ماضی کے انقلابی یا تو ربازہ کے دور افتادہ صحرا میں مرے یا مریال آزر کے میدانوں میں مارے گئے۔ انقلاب کی دوسری نسل جنہوں نے تحریک چلائی اور جدوجہد کی انہیں بڑے پیمانے پر قتل کیا گیا۔ دوسرے یا تو تقدیر کے مایوسی کے فلسفے میں مصروف ہیں یا مذہبی رہنماؤں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات کو بدلنے کی کوئی بھی کوشش بے سود ہے۔
تجربے سے انہوں نے یہ جان لیا ہے کہ اسلام کی حفاظت اور حق و انصاف کے قیام کی جدوجہد اور روز بروز بڑھتی ہوئی نو جہالت کے خلاف کوئی بھی جدوجہد شکست کھا گئی ہے۔

چنانچہ اب ہجرت کے ساٹھ سال بعد تمام اختیارات جابر حکمران کے قبضے میں ہیں۔ اقدار کا تعین صرف اور صرف حکمران حکومت کرتے ہیں۔ آئیڈیاز بنانے اور سوچنے کے ایجنٹوں کے ذریعہ خیالات اور خیالات تیار ہوتے ہیں۔ مذہب کے نام پر پیش کیے گئے مواد سے دماغوں کو دھویا، بھرا اور زہر آلود کیا جاتا ہے۔ عقیدے بدل جاتے ہیں، خریدے جاتے ہیں، مفلوج ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بھی

کوشش کامیاب نہ ہو تو ایمان تلوار سے کٹ جاتا ہے۔ اب حسین اس طاقت کے خلاف میدان میں آگئے ہیں، وہ طاقت جس کے پاس افکار، دین، قرآن، دولت، تلوار، تبلیغ، عوامی ہتھیار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہے۔
حسین خالی ہاتھ نظر آئے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ کیا کر سکتا ہے؟ کیا وہ سنیاسی بن کر عبادت کے لیے کسی کونے میں بھاگ سکتا ہے؟ کیا وہ یہ سمجھ کر خاموش رہے کہ چونکہ وہ رسول اللہ کا نواسہ، علی اور فاطمہ کا بیٹا ہے، اس لیے اس کے لیے جنت کی ضمانت دی گئی ہے؟

یہ دلیل اس کے پاس نہیں ہے۔ دوسرے مومن اس پر یقین رکھتے ہیں لیکن وہ ذمہ دار ہے، پابند ہے۔ کیا وہ جہاد کرنے کی اپنی ذمہ داری کو نماز پڑھنے اور پڑھنے کے ذریعے قرب الٰہی میں بدل سکتا ہے جو یقیناً آسان ہے؟ وہ اس حل کا انتخاب نہیں کر سکتا کیونکہ ہجرت کے صرف 60 سال گزر چکے ہیں اور ابھی تک کوئی دعائیہ کتابیں نہیں چھپی ہیں۔ اس کے پاس دو راستے کھلے ہیں - یا تو "نہیں" کہنا۔

میں قبیلہ بنی امیہ کے خلاف سیاسی لڑائی شروع نہیں کر سکتا کیونکہ اس طرح کی لڑائی کے لیے فوج کی ضرورت ہوتی ہے اور میرے پاس طاقت نہیں ہے اس لیے مجھے صرف بیٹھ کر ایک فکری، ذہنی جہاد کرنا ہو گا۔'' لیکن امام حسینؑ اس حل کا انتخاب نہیں کر سکتے۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعد میں امام جعفر صادق، چھٹے امام، پیغمبر کے بعد نویں پشت میں (742 - 752 عیسوی) نے ایک فکری مکتب قائم کیا تو اس کی وجہ دو حقیقتیں ہیں۔ اموی حکومت کے آخری ایام اور خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں ایک طرف یونانی فلسفہ مسلمانوں کے افکار میں داخل ہوا اور دوسری طرف ہندوستانی اور ایرانی تصوف کے ساتھ ساتھ عیسائیت بھی مسلمانوں کے دلوں میں بہت زیادہ عزیز ہوگئی۔

ان کی وجہ سے عباسیوں کے زمانے کے مسلمان دانشور سیاست کے بارے میں سمجھدار ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ صحیح اور غلط، حق اور باطل کے بارے

میں سوچنے لگتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ علی کیوں گئے اور معاویہ کیوں آئے؟ وہ سوچنے لگے کہ معاشرے پر کس کو حکومت کرنی چاہیے اور کس کو نہیں کرنی چاہیے۔ ان کا تعلق ’’محبت کے سات شہر‘‘ سے ہے۔ وہ پہلی افراتفری کے دوسرے افراتفری کے ساتھ تعلق پر قابض ہیں' جو بظاہر خود ہی سامنے آیا تھا۔ ان کا تعلق اس اصل یا بنیادی مادّے کی شناخت سے ہے جس سے خدا نے دنیا کو تخلیق کیا تھا۔ یہ قرآن کے فلسفیانہ سوالات ہیں جو ان سے متعلق ہیں یا قرآن میں کچھ خاص علمی سوالات کی دریافت سے متعلق ہیں۔ لیکن اگر وہ ان کا جواب دینے میں کامیاب بھی ہو گئے تو ان کے جوابات ایک پیسے کے بھی قابل نہیں ہیں۔

دھیرے دھیرے روح، جسم، انتشار، جوہر، انتساب، محبت، پہلا دور، آخری ،دور، عناد، غبن وغیرہ کے سوالات ان میں پیدا ہوتے ہیں لیکن ذمہ داری، معاشرہ برادری، عدل، مساوات، قیادت وغیرہ کے مسائل یکسر فراموش کر دیے گئے ہیں۔

،حکومت نے اپنے اپنے مکاتب فکر بنانا شروع کر دیے ہیں اور انہیں علم الٰہیات عقلیت، فلسفے اور نظریات فراہم کیے ہیں تاکہ اسلام کی جڑیں بدل سکیں اور پھر حکومت اپنی اہلیت کا جواز پیش کر سکے۔

ایسی صورت حال میں فکری جدوجہد واجب ہے خاص طور پر امام صادق جیسے شخص کے لیے جس کے سیاسی جدوجہد میں شامل ہونے کا کوئی امکان نہیں، جس نے کہا ہے کہ ’’اگر میرے پاس صرف سات وفادار سپاہی ہوتے تو میں بغاوت کر دیتا‘‘۔

لیکن امام حسین کے زمانے میں صورت حال مختلف ہے۔ ہجرت کے ساٹھ سال بعد بھی مغربی فلسفے کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ اسلام کی حقیقت اور حقیقت کو بدلنے والے علوم ابھی تک اس میں داخل نہیں ہوئے۔ اسلام کی اصل جڑیں، اس کی یادیں اور لوگ آج بھی اس کی واضح یاد رکھتے ہیں۔

معاویہ چاہتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام دمشق کی مسجد میں بیٹھ کر دینیات کی تعلیم دیں، قرآن کی آیات، اسلامی ثقافت، توحید، تاریخ اسلام یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسوم و اطوار یا کوئی اور چیز جو وہ چاہیں بیان کریں۔ یہاں تک کہ وہ اس کے لیے بجٹ فراہم کرنے کے لیے بھی تیار ہے بشرطیکہ امام حسین سیاسی سرگرمی میں مشغول نہ ہوں جسے معاویہ امام کے لیے کمتر سرگرمی سمجھتا ہے! لیکن امام جانتے ہیں کہ 'معاشرے میں کسی بھی عمل کی قدر دشمن کو کتنی تکلیف پہنچتی ہے!' اسے کیا کرنا چاہیے؟ اسے بغاوت کرنی ہوگی۔ مسلح انقلاب؟ مسلح انقلاب کو طاقت کی ضرورت ہے اور امام حسین کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔

حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو بہت مشہور ہوئی ہے اور اس پر بہت حملے ہوئے ہیں۔ اس کے مشمولات نادانستہ طور پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا کہ ہمارے علماء کی لکھی گئی کتابوں میں سے یہ واحد کتاب ہے جو خود مصنف کے مطالعے پر لکھی گئی ہے۔ تمام دستاویزات کو جمع کیا گیا ہے اور دونوں نظریات، حامی اور مخالف، پیش کیے گئے ہیں، تجزیہ، وضاحت اور تنقید کی گئی ہے.

مصنف نے انہیں رد یا منظور نہ کر کے بھی بڑی جرات کا مظاہرہ کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ ایک نئے سائنسی نظریہ کا اعلان کرنے کے قابل ہونے کے لیے سائنسی تحقیق کرنے کے لیے حوالوں کی ایک وسیع رینج کے ساتھ ایک وسیع مطالعہ کرتا ہے۔ یہ اس کتاب کی اقدار ہیں اور میں مصنف کی تعریف کرتا ہوں حالانکہ میں اسے ذاتی طور پر نہیں جانتا ہوں۔ میں ایک سائنسدان کی حیثیت سے ان کا احترام کرتا ہوں جس نے ایک آزاد مفکر کی حیثیت سے سنجیدہ تحقیق، وضاحت اور تجزیہ کیا ہے جس میں وہ ایک نئے مقالے کا اعلان کرتے ہیں۔ "امام حسین نے اپنے حقوق اور عوام کے حقوق کے حصول کے لیے ایک ظالم حکومت

کو تباہ کر کے حکمران حکومت اور حکومت کے خلاف سیاسی یا فوجی بغاوت کرنے کے لیے مدینہ چھوڑ دیا۔"

میں اس نظریہ سے متفق نہیں ہوں، اگرچہ یہ ایک مثالی نظریہ ہے، لیکن یہ صورت حال کے خاص حقائق کے مطابق نہیں ہے۔ ایک شخص نے اس نظریہ کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "امام حسین ایک سیاست دان نہیں تھے تاکہ حکمران اقتدار کے خلاف بغاوت کر سکیں۔"

حیرت کی بات ہے! پھر نبی اور علی کس مقصد کے لیے لڑ رہے تھے؟ امام حسین علیہ السلام کس مقصد کے لیے لڑ رہے تھے؟ کیا یہ سیاست کا سوال نہیں ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ عوام پر مجرموں کا راج ہے؟ اس لیے ذمہ دار کو چاہیے کہ ظلم کو ختم کرے اور حکمرانی پر قبضہ کر کے عوام کو ان کے حقوق دے۔ ایسا کرنا نہ صرف قائد کا حق ہے بلکہ اس کا فرض بھی ہے۔

لہٰذا یقیناً امام کو چاہیے کہ وہ غاصب حکومت کے خلاف عسکری یا سیاسی طور پر اٹھ کھڑے ہوں اور طاقتور جاہلیت کو ختم کریں، اپنی انقلابی طاقت کے ذریعے حکومت کریں اور معاشرے میں حق کو قائم کریں اور قیادت کو اپنے قبضے میں رکھیں۔

میں یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ عسکری یا سیاسی انقلاب امام حسین علیہ السلام کا مشن ہے لیکن حقیقت میں وہ اہلیت نہیں رکھتے۔

جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ امام حسین نے سیاسی اور فوجی بغاوت کی تھی، وہ اس دلیل کو استعمال کرتے ہیں کہ کوفہ ایک ایسا مرکز تھا جس نے امام حسین، ان کے خاندان اور پیغمبر اور علی کے خاندان کی حمایت اور حفاظت کی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ایران کوفہ کے پیچھے ہے اور ایرانیوں نے علی اور ان کے خاندان کا ساتھ دیا اور یہاں تک کہ ان کا ماننا ہے کہ تمام کوفہ امام حسین علیہ السلام کے قبضے میں ہے اور کوفہ کے لوگ امام حسین کے ایجنٹ مسلم ابن عقیل کے وفادار اور وفادار تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوفہ اتنا طاقتور ہے، اس صورت میں کہ امام حسین وہاں تک پہنچ سکتے ہیں، تو وہ اسے ایک مضبوط اسلامی بنیاد میں تبدیل کر سکتے تھے اور دمشق کو بھی شکست دے سکتے تھے اور اپنی قیادت میں ایک آزاد اسلامی حکومت قائم کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ امام حسین کی تحریک کوئی سیاسی اور عسکری نہیں تھی۔

میں اس وجہ سے یہ نہیں بتاتا کہ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کا سیاست میں آنا اور سیاسی انقلاب برپا کرنا ایک عیب ہے۔ نہیں یہ امام کا فرض ہے۔ میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کے پاس ایسا انقلاب لانے کے امکانات موجود نہیں تھے۔

آپ بحث کر سکتے ہیں: یہ کیسے ممکن ہے کہ اگر امام حسینؑ کوفہ پہنچ چکے ہوتے تو آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ کوفہ میں دمشق کو شکست دینے اور حکومت کی قیادت امام حسینؑ کو سونپنے کا امکان تھا؟ اس لیے آپ امام حسین کی بغاوت کو اموی حکومت کے خلاف سیاسی اور فوجی انقلاب کیوں نہیں مانتے؟ اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے ہمیں مدینہ سے امام کی تحریک کے آغاز اور شکل کو دیکھنا چاہیے۔

امام حسین مدینہ سے نکل کر مکہ چلے گئے۔ مدینہ میں، اسے اہل کوفہ کی دعوت موصول ہوئی، "ہم آپ پر یقین رکھتے ہیں اور آپ سے قیادت کو قبول کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ ہمیں آپ کی قیادت کی ضرورت ہے، ہمیں آپ کو اقتدار دیں گے۔ ہم غاصبانہ اور ظلم کے خلاف آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ ہم آپ کا دفاع کریں گے۔ براہ کرم ہمیں اس استحصالی حکومت سے رہائی دلائیں۔"

مدینہ میں، امام حسین نے اعلان کیا: "اپنے دادا اور والد کی روایات کی پیروی کرتے ہوئے، میں 'لوگوں کو نیکی کی دعوت دینے اور برائی سے منع کرنے' کے لیے مدینہ سے نکل رہا ہوں۔ "پھر وہ 600 کلومیٹر کا سفر کر کے اپنے اہل خانہ کے ساتھ کھلے عام مکہ پہنچا۔

مکہ میں وہ سالانہ حج کے لیے آنے والے حاجیوں سے اعلان کرتا ہے کہ ’’میں اپنی موت کو جا رہا ہوں‘‘۔ سیاسی بغاوت کی منصوبہ بندی کرنے والا شخص ان شرائط میں بات نہیں کرتا۔ وہ کہے گا کہ میں مارنے کے لیے لڑنے جا رہا ہوں، فتح کروں گا، دشمن کو نیست و نابود کروں گا۔

،لیکن امام حسین علیہ السلام نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "موت بنی آدم کے لیے ایسی ہی خوبصورت ہے جیسے ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کے گلے میں ہار، موت بنی نوع انسان کے لیے زینت ہے۔" پھر موت کی طرف جانے کے لیے مکہ سے نکلتا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک سیاست دان، جو قبیلہ بنی امیہ کی طاقت کے مرکز میں رہ رہا ہو اور حکمران حکومت کے ایک ضلع سے گھرا ہوا ہو، اسے دور دراز کے شہروں میں سے ایک سے بھیجی گئی دعوت کے جواب میں، جس نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی، ان کے پاس جاکر ان کی انقلابی قیادت کو قبول کرنے کے لیے ان کے پاس جائے اور پھر باضابطہ اعلان کرے کہ "میں آرہا ہوں" اور اپنے تمام اہل خانہ، بیوی بچوں اور تمام افراد کو ساتھ لے کر چلا جائے۔ اس کے خاندان کی خواتین کھلے کارواں میں - خفیہ طور پر نہیں - ایک شہر سے دوسرے قصبے تک قدرتی طور پر چلتی ہیں جن پر تمام دشمنوں کا قبضہ ہے جو مرکزی حکومت کے حامی ہیں؟ وہ اس طرح چھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے مکہ میں داخل ہوا۔

وہاں وہ تمام لوگ جن پر دمشق کی حکومت ہے، تمام طاقتیں، محاذ اور اسلامی قوم پرست جمع ہیں۔ یہاں اس نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ وہ کوفہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ جزیرہ نما عرب کے مغربی کنارے سے نکلتا ہے اور پورے مشرقی مغربی قطر سے گزرتا ہوا اسی طرح عراق جاتا ہے اور کوفہ کے قریب پہنچتا ہے جو بغاوت اور انقلاب کا مرکز ہے۔ ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت ایسی تحریک کی اجازت نہیں دے گی۔

اگر کوئی معروف سیاسی شخصیت یا ایک عام مخالف سیاست دان بھی ملک سے باہر نکلنے والے انقلابیوں کے ساتھ شامل ہونے، حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے ملک چھوڑنے کا ارادہ رکھتا ہے، تو یہ واضح ہے کہ اسے کن حالات میں اور کس انداز میں ملک چھوڑ کر ان سے رجوع کرنا چاہیے۔

یقیناً اسے اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ وہ دعوت نامے کو ظاہر نہ کرے۔ اسے اپنے مقصد اور سفر کو بالکل خفیہ رکھنا چاہیے تاکہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ حکومت سے باضابطہ اعلان کرتا ہے کہ "میں حکومت کی مخالفت کرنے والا انقلابی ہوں، میں حکومت کی بیعت نہیں کروں گا۔ میں ملک چھوڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ ملک سے باہر کے انقلابی گروپ میں شامل ہو کر موجودہ حکومت کے خلاف ان کے ساتھ مل کر لڑوں، انقلابیوں نے مجھے اپنا لیڈر بننے کے لیے کہا ہے، اس وجہ سے مجھے پاسپورٹ نہیں ملے گا، میں پاسپورٹ جاری نہیں کروں گا، لیکن میں پاسپورٹ جاری نہیں کروں گا!" اسے پکڑو اور تباہ کرو. لیکن امام حسین کیا کرتے ہیں؟

،وہ باضابطہ، واضح اور واضح طور پر حکومت، حکمران اقتدار، فوجی گورنر عوام کے سامنے اعلان کرتا ہے، "میں اپنی بیعت نہیں کرتا، میں مکہ چھوڑ رہا ہوں، میں کوفہ کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، میں موت کی طرف ہجرت کر رہا "ہوں، میں منتقل ہونے لگا ہوں۔

اگر لوگوں کو اچانک معلوم ہو جاتا کہ امام حسین علیہ السلام شہر چھوڑ چکے ہیں، اگر امام حسین علیہ السلام چپکے سے شہر چھوڑ کر چلے جاتے، اگر وہ خاموشی سے ہجرت کر کے قبائل کی مدد سے کوفہ پہنچ جاتے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی، تو کچھ عرصہ بعد مرکزی حکومت کو معلوم ہو جاتا کہ وہ کوفہ میں ہیں اور انقلابیوں میں سے امام کی حکومت کے خلاف بغاوت ہو گی۔

لیکن ان کی تحریک کی شکل، قافلے کے ساتھ ان کی حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کسی اور مقصد کے لیے منتقل ہوئے ہیں۔ اس کا مقصد نہ بھاگنا ہے اور نہ ہی خلوت کی تلاش ہے۔ وہ فکری، سائنسی، مذہبی اور اخلاقی امور کے لیے نہ تو ہتھیار ڈال رہا ہے اور نہ ہی سیاست اور سیاسی بغاوت کو ایک طرف رکھ رہا ہے اور نہ ہی فوجی انقلاب کے لیے۔ پھر کیا؟

بات اس نہج پر پہنچ چکی تھی کہ خیالات مفلوج ہو چکے تھے۔ شخصیات بک چکی تھیں۔ وفادار تنہا رہ گئے ہیں۔ خوبیوں کو الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔ نوجوان یا تو مایوسی کی حالت میں ہیں یا وہ خود کو بیچ چکے ہیں۔ اسلام کے اہم علمبرداروں کو یا تو شہید کر دیا گیا یا خاموش کر دیا گیا اور گلا گھونٹ دیا گیا یا بیچ دیا گیا۔ یہ وہ وقت ہے جب کمیونٹی سے کوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔ قلم ٹوٹ گئے ہیں۔ زبانیں کاٹ دی گئی ہیں۔ ہونٹوں کو پیمانہ بند کر دیا گیا ہے۔ سچائی کے تمام ستون گر چکے ہیں، اور وفادار پیروکاروں کے اوپر گر گئے ہیں۔

امام حسین ایک ذمہ دار رہنما کے طور پر دیکھتے ہیں کہ اگر وہ خاموش رہے تو اسلام حکومت کے مذہب میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسلام کو عسکری اور معاشی طاقت میں بدل دیا جائے گا اور کچھ نہیں۔ اسلام دوسری حکومتوں اور طاقتوں جیسا ہو جائے گا۔ جب ان کی طاقت ختم ہو جائے گی، جب ان کی فوج اور حکومت ختم ہو جائے گی تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ یہ تاریخ میں ایک یادداشت کے سوا کچھ نہیں ہوگا جو ماضی میں پیش آیا اور ختم ہوگیا۔

یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ اب دو کمزوریوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ وہ نہ خاموش رہ سکتا ہے اور نہ لڑ سکتا ہے۔ وہ خاموش نہیں رہ سکتا کیونکہ وقت اور مناسب موقع گزر رہا ہے۔، لوگوں کے جذبات، افکار، مکاتب فکر، اہداف اہداف، مفہوم، آدرشوں کے ذہنوں اور گہرے ضمیروں میں ہر چیز کو تباہ، ختم کیا جا رہا ہے، وہ سب کچھ جو محمد کے پیغام سے لایا گیا، وہ تمام اسلام جو اس نے جہاد، عظیم کوششوں اور جدوجہد کے ذریعے لایا اور ترقی کی۔ باقی سب

حکمران اقتدار کی اطاعت کر رہے ہیں۔ انہیں دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ ان کا موجودہ ماحول مکمل خاموشی، دھڑکن اور ہتھیار ڈالنے والا ہے۔ وہ خاموش نہیں رہ سکتا کیونکہ ظلم کے خلاف لڑنا اس کا فرض ہے۔

،دوسری طرف وہ لڑ نہیں سکتا کیونکہ اس کے پاس فوج نہیں ہے۔ وہ حکمران جابر حکومت میں گھرا ہوا ہے۔ وہ نہ تو چیخ سکتا ہے، نہ ہتھیار ڈال سکتا ہے اور نہ ہی حملہ کر سکتا ہے۔ وہ خالی ہاتھ رہتا ہے پھر بھی ان تمام ذمہ داریوں ،کا بھاری بوجھ اس کے کندھوں پر ہے۔ اسے اپنے دادا، رسول اللہ، اپنے والد حضرت علی اور اپنے بھائی امام حسن کی جدوجہد اور کوششوں کی طاقت اور ثمرات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، سوائے ایک اعزاز، ایک مصیبت اور بہت بھاری ذمہ داری کے۔ وہ اکیلا ہے، غیر مسلح ہے۔ اس کی مخالفت دنیا کی سب سے وحشی سلطنتوں میں سے ایک ہے جس پر تقویٰ، تقدس اور اتحاد کا سب سے خوبصورت اور فریب خوردہ غلاف چڑھا ہوا ہے جو حکمران طاقت کے پاس ہے۔

وہ اکیلا ہے۔ وہ ایک تنہا آدمی ہے جو اس مکتبہ فکر کا ذمہ دار ہے۔ اس مکتبہ فکر میں تنہا آدمی بھی تقدیر کی فیصلہ کن طاقت کا مقابلہ کرنے کا ذمہ دار ہے کیونکہ ذمہ داری شعور اور ایمان سے ظاہر ہوتی ہے نہ کہ طاقت اور امکان سے۔ جو زیادہ باخبر ہے وہ زیادہ ذمہ دار ہے اور امام حسینؑ سے زیادہ باخبر کون ہے؟

اس کی ذمہ داری کیا ہے؟ وہ حق کی نابودی، عوام کے حقوق کی تباہی، تمام اقدار کی نابودی، انقلاب کی تمام یادوں کے خاتمے، انقلاب کے پیغام کو تباہ کرنے، اور عزیز ترین ثقافتوں اور لوگوں کے ایمان کی حفاظت کے لیے ذمہ دار ہے، کیونکہ ان کی تباہی ہی غلیظ ترین لوگوں کا مقصد ہے۔ وہ ایک بار پھر نامعلوم، پراسرار ،موت، جلاوطنی، لوگوں کو زنجیروں میں جکڑنا، عیش و عشرت کی عبادت تفریق، دولت جمع کرنا، انسانی اقدار، ایمان، عزت کو بیچنا، نئی مذہبی حماقتیں، نسل پرستی، نئی اشرافیہ، نئی جہالت اور ایک نیا شرک پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

عوام کے افکار اور جرائم کے خلاف ان تمام خیانتوں کے خلاف مزاحمت، جدوجہد اور لڑنے کی ذمہ داری، عوام کے خلاف حملے اور نئی قدامت کے خلاف کیے جانے والے جہاد اور اس عظیم الہی انقلاب کی حفاظت کی ذمہ داری ایک انسان کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ تنہا! حق، انصاف، بیداری، عوام اور خدا کی صف میں کوئی اور نہیں رہا۔ تمام محاذوں کو رہا کر دیا گیا ہے۔ تمام محافظ یا تو مارے جا چکے ہیں یا بھاگ گئے ہیں۔ وہ تنہا، خالی ہاتھ، بغیر کسی امکان کے، دشمنوں سے گھرا ہوا ہے جس کی وجہ سے دوسروں کو خاموشی اختیار کرنا، لاتعلق اور عوامی جہالت کا شکار ہونا پڑا۔

وہ نہ خاموش رہ سکتا ہے اور نہ ہی چیخ سکتا ہے۔ وہ خاموش نہیں رہ سکتا کیونکہ تمام ذمہ داریاں اس تنہا آدمی کے اعمال کی منتظر ہیں۔ وہ چیخ نہیں سکتا کیونکہ اس کی آواز کی آواز بند کر دی گئی ہے۔ اس کی فریاد قربانی کرنے والوں کی خوفناک خاموشی تک نہیں پہنچے گی۔ یہ استثنیٰ کے خطرے، جہالت کی غفلت، حاکم دین کی حماقت تک نہیں پہنچ سکے گا، یہ خلافت کے جھگڑے، جھوٹی اور وحشیانہ جنگوں کو متاثر نہیں کر سکتا جو جہاد، فتح، منافع، نعروں، مجلسوں، حج، قرآن اور اسلام کے نام پر کی جاتی ہیں۔ اس دوران، رقص موسیقی اور فن کی ترقی؛ خلافت کے نام پر اقتدار، عیش و عشرت اور کرپٹ آزادیوں کا اعلان کیا جاتا ہے۔

اسے لڑنا چاہیے، لیکن وہ نہیں کر سکتا۔ کتنا عجیب ہے۔ وہ ضرور ہے اور ابھی تک اس سے قاصر ہے۔ یہ ذمہ داری اس کے شعور پر بوجھ ڈالتی ہے۔ اس کا نتیجہ 'حسین ہونے' سے نہیں اس کی 'قابلیت' سے ہے۔ وہ اب بھی حسین تنہا، نااہل، غیر مسلح اور بے بس ہے۔

وہ کیا کرے؟ 'حسین ہونا' اسے لڑنے کے لیے بلاتا ہے لیکن اس کے پاس لڑنے کے لیے کوئی ہتھیار نہیں ہے اور پھر بھی اس کا فرض ہے کہ وہ لڑے۔ حکمت اور

مذہب کے حامی، روایت اور عام قانون کے مشاہیر، نیکی اور منطق کی طرف سفارش کرنے والے، سب نے متفقہ طور پر کہا، "نہیں!"

"لیکن حسین کہتے ہیں، "ہاں۔

وہ اس مقصد کے لیے مدینہ سے نکلتا ہے۔ وہ مکہ مکرمہ میں ان تمام مسلمانوں کو اپنے انوکھے جواب کا اعلان کرنے آئے ہیں جو وہاں حج کی تقریبات کے لیے جمع ہیں۔ وہ مکہ سے اس سوال کا جواب دینے کے لیے نکلتا ہے کہ "کیسے؟" یہ سوال تاریخ کے اس اہم لمحے میں موجود تھا جس میں عوام اور اسلام کی تقدیر بدل رہی تھی اور طے ہو رہی تھی۔ اس وقت تمام چیزیں گر چکی ہیں۔ تمام دانشور اور باشعور لوگ اور وہ لوگ جو سچائی، انصاف، آزادی اسلام اور انقلاب کے وفادار ہیں، وہ تمام لوگ جو دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں، سمجھ سکتے ہیں اور اس طرح کے مصائب اور خود کو ذمہ دار محسوس کر رہے ہیں، جو اس طرح انقلاب کی تلاش میں ہیں، پھر پوچھ رہے ہیں کہ "کیا کیا جائے؟"

سب کے پاس جواب ہے۔

مقتدر کہتے ہیں "کچھ نہیں۔" جو کچھ بھی ہوا ہے خدائی حکمت اور خدائی گہرائی کے مطابق ہوتا رہے گا۔ خدا چاہتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ جو کچھ آپ کو دیا گیا ہے اس پر آپ کو مطمئن ہونا چاہیے اور اس کے لیے شکر گزار ہونا چاہیے، کیونکہ آپ کو اپنی قسمت کا فیصلہ آزادانہ طور پر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

جیسا کہ وہ کہتے ہیں، یہ درست ہے کہ ظلم و جبر، غصب، حقوق، جہاد کے دعوے، زکوٰۃ (مذہبی ٹیکس)، سنت نبوی، اسلام کی فتح، مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کے لیے قرآن کی تبلیغ کے لیے آتش گیر مندروں اور بتوں کے گھروں کو مساجد میں تبدیل کرنا، موجود ہیں۔ یہ سب جھوٹ اور فریب ہیں۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے؟ درخت سے پتا نہیں گرتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ خدا نے بہت چاہا ہے۔ اس کی حکمت اس طرح چلتی ہے۔ کوئی احتجاج، تنقید یا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیوں ہے۔ ہر کوئی اپنی قسمت سے چلتا ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا

ہے، اچھا یا برا، ابدی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے اور قرآن میں درج ہے۔ اگر علی ہار جاتا ہے اور تنہا رہ جاتا ہے، اگر معاویہ فتح کر کے اقتدار حاصل کر لیتا ہے، یہ سب خدا کی مرضی کے مطابق ہیں۔ قرآن کہتا ہے: "خدا جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔" "خدا جسے چاہتا ہے گراتا ہے۔" "خدا جسے چاہتا ہے طاقت دیتا ہے۔" اس طرح، کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ کوئی کیا کر سکتا ہے؟ کوئی صرف صبر کر سکتا ہے اور خاموش رہ سکتا ہے۔ تقدیر اور تقدیر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا شخص قناعت اور ہتھیار ڈالنے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے فلسفے کے ساتھ اہلیت، نااہلیت یا جہاد کا سوال بھی اہم نہیں ہے۔ وہ ذمہ داری کے کسی بھی احساس کو چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ صحیح ،راستہ منتخب کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ مذہبی پیشوا جواب دیتے ہیں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کس کے خلاف؟ کس کے خلاف؟ خدا تمام لوگوں سے" امید رکھنے اور نجات اور جنت کی تلاش کرنے کا کہتا ہے۔ ہم کیسے کسی شخص کی مذمت کر سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جہنم میں جائے گا اور پھر اس سے لڑے گا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ نے قیامت کے دن سے پہلے اٹھ کر اور انصاف کے دن سے پہلے مذمت کر کے ایک بے دین عمل کیا۔

کیا ہوگا اگر اس مجرم، اس مجرم معاویہ کو قیامت کے دن خدا معاف کر دے؟" اسے معاف نہ کرو اور نہ ہی اس کی سزا کا مطالبہ کرو کہ اگر کل خدا اس پر رحم کرے تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟ تمہارا کیا فرض ہے؟ کیا کرنا چاہئے؟ تم کس سے پوچھو؟ کس کو جواب دینا چاہئے؟ کس کو عمل کرنا چاہئے؟ کوئی نہیں، کچھ نہیں، ہمیں انتظار کرنا چاہئے اور خدا کیا کرتا ہے"۔

،دوسری طرف مذہبی پیشوا یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ ابوبکر، عمر، عثمان علی، طلحہ، زبیر، معاذ ویہ اور یزید سب رسول اللہ کے اصحاب تھے۔ وہ سب مجاہد تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے نتائج اور مذہبی فہم کے مطابق کام کیا۔ مقدس اور ناپاک، ظالم اور مظلوم، دوست اور دشمن میں کوئی فرق نہیں

ہے۔ ماہرین عوام کے خیالات پر غور کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ عام لوگوں کو مذہبی ماہرین اور علمائے دین کی باتوں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ خدا آخری جج ہے۔ خدا بڑا رحم کرنے والا ہے۔ آپ کو اور مجھے اس کی وجہ پوچھنے کی اجازت نہیں ہے۔

سخت مذہبی گروہ، بنیاد پرست، جواب دیتے ہیں؛: "خدا کے پاس جتنے راستے ہیں اتنے ہی لوگ ہیں، کیا جہاد ہی واحد جواب ہے؟ عبادت نماز دین کے ستونوں میں سے ایک ہے جب کہ جہاد نیک کاموں کی ترغیب دینے اور برے کاموں سے منع کرنے سے متعلق شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔ کیا آپ کو نمازوں میں شکوک و شبہات کے تمام احکام یاد ہیں جو کہ آپ نے نماز کے پاکیزہ اور واجب احکام کو جان لیا ہے؟

کیا تم میں سے جو لوگ لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور جو ان کی رہنمائی" اور رہنمائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، انہوں نے اپنی اصلاح کی ہے؟ کیا آپ اس مقام ،پر پہنچ چکے ہیں کہ کبھی کسی غلطی پر ٹھوکر نہ کھائیں؟ خود غرض نہ ہو کوئی خواہش نہ ہو، خواہشات کے پورے جسم سے آزاد ہو، مکمل طور پر پاک اور معصوم ہو؟ کیا تمہارے تمام خیالات اور اعمال، حتیٰ کہ معمولی سے بھی خدا کی رضا کے لیے ہیں؟ کیا آپ نے اپنے مذہب کے تمام اصولوں کو درست کر لیا ہے، اور کیا آپ اپنے آپ کو معصوم سمجھتے ہیں اور اب آپ معاشرے کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں؟

دوسری طرف، جنت کے آٹھ دروازے ہیں، آپ پر صرف جہاد کے دروازے سے" داخل ہونا فرض نہیں ہے۔ جہاد صرف ان کنجیوں میں سے ایک ہے جو جنت کے دروازے کھولتی ہے۔ نماز، عبادت کی دوسری صورتیں، اور ترانے زیادہ محفوظ کنجی ہیں اور آپ ان کو بغیر کسی نقصان، نقصان، خطرے یا خطرے کے !استعمال کر سکتے ہیں

بہت سارے خیراتی امور ہیں جو آپ کو ایک ہی مقام پر لے جائیں گے جیسے کہ" ضرورت مندوں کو کھانا کھلانا، غریب خاندانوں کی دیکھ بھال، مقدس مقامات ،کی زیارت، نماز، زہد، تقویٰ، منتیں کرنا، لگن، اپنے پڑوسی کی مدد کرنا، ترانے دعائیہ تقریبات، نوحہ خوانی اور شفاعت۔ آپ اسی مقصد تک پہنچ جائیں گے جس نے اپنے آپ کو زیادہ دکھ پہنچانے کا انتخاب کیا اور کیوں تکلیف اٹھا کر اس شخص کا انتخاب کیا۔ جہاد کا مشکل عمل" بعض دعاؤں کی کتابوں میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس کتاب میں صرف چند دعائیں پڑھنے سے آدمی کو جنگ بدر میں ستر شہیدوں سے زیادہ اجر و ثواب ملتا ہے! تو کیا یہ واضح نہیں ہے کہ کیا کرنا "چاہئے؟

ایک اور گروہ کا خیال ہے کہ کسی مقدس شخصیت یا مذہبی پادری کا سیاسی معاملات میں داخلہ حقیقی مذہب سے انحراف ہے۔ اس کا مطلب ہے دین کو مادیت پرستوں کے ہاتھ بیچنا اور اخلاقیات اور مذہبی امور کی طرف توجہ دینے کے بجائے دولت اور دنیاوی چیزوں کو جمع کرنا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں مل سکتے۔

کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدس جنگ سے واپسی پر یہ نہیں کہا تھا" کہ 'ہم اب چھوٹے جہاد سے واپس آ رہے ہیں لیکن ہمارا مقابلہ عظیم جہاد سے ہے'۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ اس سے بڑا جہاد کیا ہے اس نے جواب دیا، 'جہاد نفسانی خواہشات کے خلاف!' اس لیے چھوٹے جہاد کو ایک طرف رکھ کر صرف "بڑے کے لیے حاضر ہونا چاہیے نہ کہ کسی بیرونی دشمن سے۔

صحابہ کرام، نامور شخصیات، ماہرین الہیات اور مذہبی اسکالرز، جو حکومت پر منحصر ہیں، اعلان کرتے ہیں، "علی کی طرز فکر عملی نہیں ہے اور بہت زیادہ سختی پر مشتمل ہے، یہ بہت سخت ہے، حقیقت پر غور کرنا چاہیے، ایک حقیقت پسند ہونا چاہیے، آئیڈیلسٹ نہیں، علی نے دنیا کے بڑے حصے پر حکمرانی کی، لیکن وہ آج بھی عام لوگوں کو اپنے جوتے کی طرح انصاف کرتے ہیں

جو وہ اپنے کام کو دیکھتے ہیں! یہ خاص طور پر اس وقت سے درست ہے جب ایران اور روم کو شکست ہوئی ہے اور مسلمانوں نے ایران کے بادشاہوں اور روم کے قیصروں کی شان و شوکت اور عظمت کو دیکھا ہے، نہیں، اس طرح کا رہنا کسی اسلامی حکومت کی عزت و وقار کے لیے اچھا نہیں ہے۔

دوسری طرف، کیا ایران اور روم کے اشرافیہ معاشروں میں علی کی حکومت کو" برداشت کیا جا سکتا ہے؟ جب علی کو خلیفہ مقرر کیا گیا، تو اس نے تنخواہوں کے تمام پیمانے بدل دیے، سب کو برابر بنا دیا، اس نے تین درہم کی وہی تنخواہ عثمان بن حنیف کو دی، جو عظیم اور اہم سیاست دان تھا اور علی کو حکومت میں ایک قریبی دوست اور قریبی افسر کے طور پر دیا!" اس خیال کے مطابق یہ معاشی نظام ناقابل عمل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہم نے دیکھا اور اب بھی یاد ہے کہ ایران میں، جو اب عربوں کے قبضے میں ہے اور علی کی حکومت والی اسلامی سلطنت کا حصہ ہے، جب خسرو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آرہا تھا، اس نے محسوس کیا کہ جنگ کی شرائط کے مطابق، زیادہ سے زیادہ تقریبات کو چھوڑ "!دینا چاہیے، اس کے ساتھ سات ہزار عورتیں، غلام، نوکر اور موسیقار تھے

وہ کہتے ہیں، "ہم اس بات پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ یہ صحیح تھا یا نہیں۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ اگر علی ناکام ہوا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا مکتبہ فکر عملی نہیں تھا۔ وہ خود کو موجودہ حالات اور سماجی حقائق کے مطابق ڈھال نہیں سکتا تھا۔ وہ سیاست دان نہیں تھا! وہ ماہر سماجیات نہیں تھا! اس نے سب کو ناراض کیا، وہ بہت سخت تھا۔ اس نے کبھی بھی طاقتوروں کے سامنے "خود کو عاجز نہیں کیا۔ اشرافیہ یا شریف خاندان۔

وہ کہتے ہیں کہ خلافت کا تقابل امامت و نبوت سے نہ کرو، معاویہ اور یزید کا پیغمبر اور علی سے موازنہ نہ کرو! تم ان کا موازنہ قیصروں اور بادشاہوں سے کرو۔ دمشق کی موجودہ عدالت جسے تم نے سبز محل بنانے کا اعلان کیا ہے، جس میں عوام کا سرمایہ لگایا گیا ہے اور وہاں سے ایران پر اسلامی حکمرانوں کے حقوق کو

پامال کیا گیا ہے۔ روم وغیرہ لیکن یہ پھر بھی رومی کونسل کے محل یا کسی افسر "سے زیادہ عاجز ہے جسے شام کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔

ابوذر نے معاویہ پر ان الفاظ کے ساتھ حملہ کیا، "تمہاری روٹی بلیچ شدہ گندم سے کیوں بنی ہے اور تم صرف گیہوں کا مرکز کیوں کھاتے ہو؟ تم دن کو الگ اور "رات کو دوسرا لباس کیوں پہنتے ہو؟

علی کے پیروکاروں کا ماننا ہے کہ ہم ابھی بھی مدینہ میں اسی طرح رہ رہے ہیں جیسا کہ پیغمبر کے زمانے میں تھا اور یہ کہ 'مہذب' رومی اور ایرانی جو اسلامی دنیا !میں شامل ہوئے ہیں وہ مہاجر اور مددگار ہیں

وہ کہتے ہیں، "ہمیں مسائل کی نسبت پر غور کرنا چاہیے۔ درست عبادت اور مطلق العنانیت مثالی ہے۔ آپ کو حقائق کو دیکھنا چاہیے۔ دنیا کے ایک اہم حصے پر حکمرانی کرنے والے غریب، پسماندہ مسلمانوں کو یہ باور کرانا ممکن نہیں ہے کہ دو سلطنتیں مشرق اور مغرب کے پاس ہیں، ان میں سے ایک کو اسی طرح رہنا چاہیے جیسا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیا تھا یا علی علیہ السلام کے معیار کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔

،روایات، ضابطے، معاشرت کے آداب، معاشی اور اشرافیہ کے نظام، افکار، خیالات ذوق، ادب، شاعری، موسیقی، رقص، تفریح، سماجی تعلقات، اخلاقیات و آداب مہذب' روم اور ایران، سماجی طبقاتی نظام اور اشرافیہ کی حکومت، قیصروں اور' بادشاہوں کا سیاسی نظام، روایات اور قسم کی روایات اور حامیوں کی قسمیں ،ہیں۔ درجہ بندی بیوروکریٹ، سرکاری اور کلاسیکی نظام حکمرانی، اور آخر کار ترقی پسند ایرانی اور رومی تہذیبوں کا یقیناً سادہ اسلامی معاشروں پر اثر تھا۔

مسلمانوں کی فتوحات میں جو مال و دولت، اقتدار، عہدہ اور لاتعداد مال غنیمت کمایا گیا تھا، اس سے لوگوں کو موٹا ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اب علی کی نصیحت، ان کے ہدف اور مصائب پر کان نہیں دھرتے۔ عوام کی اکثریت اس صورتحال سے کافی خوش ہے۔ انہیں اب ایسے مسائل کا شوق نہیں رہا۔

وہ ان کے لیے کوئی حساسیت نہیں دکھاتے۔ یہ لوگ اب دولت اور طاقت کے خادم بن چکے ہیں۔ نہ ماننے والوں کو تلوار سے آزمایا گیا!

کیا آپ کو یاد ہے کہ علی اور فاطمہ کے ساتھ ان کے اپنے ہی شہر مدینہ میں، ان کے اپنے وقت میں، ان کے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ہاتھوں، اور جو ان کے ساتھ اسی درجہ میں لڑے تھے، ان کے ساتھ کیا ہوا؟

آپ نے دیکھا کہ قبیلہ امیہ مدینہ یا سقیفہ میں موجود نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی بھی انتخابی کمیٹی (شوریٰ) کا حصہ نہیں تھا۔ کیا آپ کو حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شاندار پس منظر کے حامل اعلیٰ افسران یاد ہیں؟ اور، جنگ کے عروج پر انہوں نے اپنے آپ کو معاویہ کے ہاتھ کیسے بیچ دیا؟ انہوں نے اپنے آپ اپنے مذہب، اپنی ماضی کی عزت نفس اور اپنے زیرکمان سپاہیوں کے ساتھ معاویہ کے ساتھ کیسے اچھا سلوک کیا؟

خوارج کا تعلق نہ تو قبیلہ بنی امیہ سے تھا اور نہ ہی ان کا تعلق اموی حکومت سے تھا۔ یہاں تک کہ وہ امویوں اور ان کی حکومت کے خونی دشمن تھے۔ وہ سب کے سب عوام کی طرف سے آئے تھے، دیہی علاقوں سے عام تاجر۔ یہاں تک کہ وہ ان مقدس، پرہیزگار عقیدت مندوں کی علامت بھی رہے تھے جنہوں نے سنتی مشقیں کیں۔ وہ سخت مذہبی اقسام کی شاندار اور معروف مثالیں رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ کس طرح لاشعوری طور پر بنی امیہ کے ہاتھ میں ہتھیار بن گئے تھے۔ وہ بالواسطہ طور پر دمشق سے مشتعل ہوئے تھے اور اس طرح علی کی مخالفت کر رہے تھے۔ جنگ کے بحران میں انہوں نے علی سے بحث کی تھی اور انہیں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ وہ دشمن کے بلا معاوضہ بندے بن جاتے ہیں جو علی کو شکست دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ وہ اچھے، مذہبی لوگ ہیں جنہوں نے علی کو الزام لگا کر، ان کی توہین کر کے اور یہاں تک کہ ان پر بدتمیزی کر کے انہیں کمزور کیا۔

عمرو عاص جیسے وہ بے شمار لوگ جو لوگوں میں مشہور تھے، علی کی روحانی اور مذہبی ساکھ کو ٹھیس نہ پہنچا سکے اس لیے وہ اسے جلاوطنی کے ذریعے تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ آخر وہ کس طرح اپنے مقاصد اور جنون سے اسے قتل کرنے کا انتظام کرتے ہیں۔ ان تجربات کے ذریعے، کوئی اس کا جواب سوچ سکتا ہے، "کیا کرنا چاہیے؟" "کچھ نہیں" ہے۔ معاویہ ان لوگوں کے لیے موزوں ہے، علی کو نہیں۔ دوسری طرف، معاویہ، اپنے تمام کمزور نکات اور انحرافات کو مدنظر رکھتے ہوئے، ایک جدید مفکر اور علی سے زیادہ حقیقت پسند ہے۔ علی کا ارادہ ہے کہ لوگوں کو تقویٰ اور سادگی سے گزارا جائے جو کہ ناممکن ہے۔ لیکن معاویہ کی حکومت جابرانہ، بدعنوان اور امتیازی ہونے کے ،باوجود معاشرے کی تیزی سے ترقی کرتی ہے۔ اپنے آزاد اور لاپرواہ جذبے کے ساتھ یہ ایرانی اور رومی تہذیبوں کی تمام شکلوں اور اقسام کی آسانی سے نقل کرتا ہے۔ بیس برسوں کے دوران جو اس نے اقتدار پر فائز رہے، اندرونی مشکلات اور تضادات اور ابوذر، علی، حسن، حجر وغیرہ جیسی واضح شخصیتوں کے حل کے بعد، اس نے اسلام کے دارالحکومت کو ایک جدید اور ترقی پسند، مغرب کی طرح کی بستی میں تبدیل کردیا۔ وہ بحیرہ روم میں ایک مسلح میرین فورس قائم کرتا ہے، قبرص پر قبضہ کرتا ہے اور مشرقی رومی سلطنت کے بادشاہ کے خلاف مستقل حملے کرتا ہے۔

معاویہ کے سبز محل کی تعمیر میں رومی طرز تعمیر کی پیروی کی گئی ہے اور اسے ساسانی انداز میں سجایا گیا ہے۔ چند بدو عرب غلاموں کے بجائے، وہ رومن رقاصوں کے ساتھ بہترین ایرانی موسیقاروں سے بھرا آرکسٹرا چلاتا ہے۔ وہ قیصروں اور ایران کے بادشاہوں کے فرضی درباروں کی روایات اور رسم و رواج کی نقل کرتا ،ہے۔ ان کے لباس، کھانا، تفریح، سجاوٹ، موسیقی، شاعری، ادب، رہن سہن شہر کے منصوبے، محلات اور سماجی و سیاسی نظام سب کو اصلی اور سادہ عرب طرز سے جدید، مہذب اور 'انقلابی' رومی طرزوں میں بدل دیا گیا ہے۔

حق و باطل، ظلم و انصاف کے دلائل کو ایک طرف رکھ کر، چاہے علی حق پر ہوں یا معاویہ حق پر، تہذیب کی ظاہری ترقی اور نقطہ نظر سے بہت کچھ ہو چکا ہے اور ہوتا رہے گا۔ بہرحال دارالحکومت کی تعمیر اور تعظیم کے آلات کی تجدید، خلیفہ اور اس کے محلات کا باعزت طرز زندگی غیروں، عیسائیوں اور مجوسیوں کی نظر میں اسلام کی عزت و تکریم ہے۔ دوسری طرف حضرت علی کی سابقہ حکومت کا رومی اور ایرانی حکومتوں سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بنی امیہ کی نئی خلافت عوام کی بہتر خدمت کر رہی ہے اور ان کے لیے زیادہ مفید ہے۔ وہ لوگوں کو بہتر برتاؤ کرتے ہیں چیزیں ہموار اور آزاد ہیں۔ وہ عزت، طاقت، غنیمت، فوائد، فتوحات، توسیع، نیک نامی اور اسلام کے لیے اہمیت کا احساس بھی پیدا کر رہے ہیں۔

بہت سے مندروں اور گرجا گھروں کی جگہ مساجد نے لے لی ہے۔ پاک سرزمینوں میں بہت سے شہر اور قصبے ایسے ہیں جہاں اللہ اکبر (خدا سب سے بڑا ہے)، لا الہ الا اللہ (خدا کے سوا کوئی معبود نہیں) اور محمدن رسول اللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) کی صدائیں سنائی دے رہی ہیں۔ عوام کے خزانے میں بہت سے خزانے اور لوٹ مار چل رہی ہے۔ اگرچہ یہ رقوم صحیح طریقے سے حاصل نہیں ہوئی ہوں گی (یعنی منصفانہ اور اسلامی اصولوں کے مطابق) اسلامی ممالک میں استعمال ہو رہی ہیں۔ کچھ مسلمان اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مزید برآں، ان فتوحات سے نوجوانوں کے لیے نئے پیشے اور آمدنی، امرا کے لیے عہدے اور کچھ مسلمانوں کے لیے نوکریاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس لیے "کیا کیا جائے؟" کے جواب میں، وہ جواب دیتے ہیں، "نبی کے زمانے کے اسلام کے مثالی انقلابی معیارات پر نظرثانی کی جانی چاہیے۔ زمانہ بدل گیا ہے اور اسلام ،آج مکہ اور مدینہ کے گرد گھومتا نہیں ہے، یہ بازنطیم سے ایران تک پھیلا ہوا ہے اس لیے اسے علی کی ان نظریاتی خواہشات اور ان کے سخت اور مشکل راستوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے جو مکمل انصاف کی طرف پہنچتے ہیں۔" وہ معاویہ کی

طرف دوڑتے ہیں۔ عوام جن پر قیصر یا بادشاہ حکومت کر رہے ہیں ان سے اس کے سوا کچھ بھی برداشت کرنے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

آپ کو موجودہ حالات کو حقیقت پسندانہ طور پر دیکھنا چاہیے، آپ کو یہ" تسلیم کرنا چاہیے کہ اموی کی طاقت، سیاست، ذہانت، دولت اور قوت اسلام کے نام پر اور دنیا میں اسلام کی رسومات کو قائم کرنے، اسلام کی ترقی و نشوونما کے لیے کام کر رہی ہے، یہ ناپاک مذاہب کے خلاف جدوجہد کر رہی ہے، اسلام کی ناموس کو بڑھا رہی ہے، پیغمبر اسلام کی تہذیب کو آگے لے جانے کی کوشش کر ،رہی ہے۔" شہروں کو ترقی دینا، معیار زندگی بلند کرنا، سماجی بہبود پیدا کرنا دولت حاصل کرنا اور مشرق و مغرب کی عظیم تہذیبوں کو اس کے مطابق ڈھالنا۔

اس لیے 'کیا کرنا چاہیے؟' کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ جیسا ہمارے پاس ہے" ویسا ہی کرنا چاہیے - اموی حکومت میں داخل ہو جاؤ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ،مداخلت، اندرونی لڑائی، سیاسی کشمکش، حق، عدل، امامت، انتخاب، انتخاب ،نیکی، تقوی، عفت، روایات، بدعت، بدعت اور بدعت کی شکست و ریخت سب کے سب استعمال کے نتائج ہیں۔

،مزید برآں، جب اموی خلیفہ ایران اور روم کے خلاف عیسائیت اور مجوسیوں ناپاک اور بیرونی دشمنوں کے ساتھ مقدس جنگ لڑ رہا ہو تو یہ مناسب نہیں ہے ،کہ داخلی محاذ پر جنگ کی جائے جس سے سرکاری اسلامی طاقت کمزور ہو جائے یہ صرف اس کی ترقی کو روک دے گا۔

حقیقت پسندانہ جذبے کے ساتھ ہم سب کو سیاسی جدوجہد کو ترک کرنا" چاہیے، موجودہ حقیقت کو قبول کرتے ہوئے خلوت، تصوف اور تقویٰ کا انتخاب کرنا چاہیے، اور بنی امیہ کی حکومت کی اسلام کے لیے لوگوں کی خدمات میں مدد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جہاں تک اس کے انحرافات ہیں، ہمیں ان کی اصلاح اور اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایک طرف، ہم غریب لوگوں کی خدمت کر سکتے ہیں، مظلوموں کا حق کما" سکتے ہیں، سماجی امور انجام دے سکتے ہیں، ضرورت مندوں کی مدد کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ مذہبی طور پر سرگرم اور مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں، نظریات کو فروغ دے سکتے ہیں، معاشرے کی اصلاح کر سکتے ہیں، مستقبل میں کسی بھی بدعنوانی کے خلاف لڑ سکتے ہیں جب ہم حکمران نظام کا حصہ ہوں اور ایک اہم اور اعلیٰ عہدہ اور پیشہ ہو۔

دوسری طرف اہل علم اور اہل خط کہتے ہیں: 'ہجرت کو ساٹھ سال ہو چکے" ،ہیں، علی کا انقلاب شکست کھا چکا ہے، حسن، آخری رہنما جس نے ظلم ،قدامت اور قدیم روایات جو کہ لوگوں اور الٰہی کے خلاف تھیں، کی مخالفت کی اسے معاویہ سے صلح کرنی پڑی، اور اس کے ذریعے زہر دیا گیا، اس لیے ہمیں مذہبی مسائل میں شرکت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے، ہمیں علم کے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ فقہ، تحقیق، علمی دریافتیں اور مشاہدات اور ان ذرائع سے لوگوں کو اسلامی افکار، نظریات اور حقائق سے آشنا کرنا اور قرآن کے روحانی پہلوؤں اور سائنسی رازوں کو دریافت کرنا۔

ہمیں صرف وہ تحقیق کرنی چاہیے جس سے ہمیں علم و حکمت، استعاراتی" فلسفہ، قرآن کے اسرار، فصاحت، بلاغت، معانی، اظہار، اختراعات، بدعت، قرآن مجید کو جمع کرنے اور جمع کرنے، تربیت، تعلیم، احادیث لکھنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ، جورسہ کے طرز عمل وغیرہ میں ڈوبنے کا موقع ملے۔ ہمیں تحقیق، تربیت، دینی علم کی ترویج، عبادات اور کردار، اسلامی ثقافت کی ترویج، اسلام اور اسلامی معاشرے کی ذہنی اور سائنسی خدمت سے سروکار !رکھنا چاہیے اور کچھ نہیں

یہ اس قدر حیرت انگیز ہے کہ یہ بات دانشوروں، یعنی علی کے پیروکاروں، حتیٰ کہ علی کے خاندان والوں اور پیغمبر کے خاندان اور بنی ہاشم کے قریبی لوگوں کے ،'!لیے اتنی واضح ہے کہ اس سوال کا جواب ہے کہ 'کیا کیا جائے؟' 'کچھ نہیں

کیونکہ کسی بھی عمل کا نتیجہ شکست ہے۔ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قابیل اور ہابیل کی کہانی ہے۔ تلوار کے سامنے ننگے ہاتھ کھڑا ہونا جائز نہیں۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔ اور پھر بھی، آپ اب بھی ذمہ دار ہیں اور سزا دی جائے گی۔ کیا یہ نہیں کہا گیا کہ "اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے موت کے سامنے نہ رکھو"؟ جہاد، جہاں انسان کی تقدیر اور موت مقرر ہے، یقیناً خودکشی ہے۔ یہ ظالم اور ظالم کے فائدے میں ہے۔ یہ بیکار ہے۔

انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ خاموش رہے اور لوگوں کی مذہبی تربیت، قرآن کی تعلیم، مذہبی فقہ کی ترویج اور پیغمبر کی روایات کو دہرانے میں شرکت کرے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام طبقات بشمول وہ لوگ جو اقتدار میں تھے، مذہبی حضرات، علماء، حتیٰ کہ شیعہ بھی - یعنی وہ دانشور جنہوں نے حق کو تلاش کیا اور حقیقت کو جانتے تھے اور ان کی سماجی، ذہنی اور سیاسی پالیسی - بالکل واضح اور واضح تھی - یہ سب اس وقت، ہجرت کے ساٹھ سال بعد زمانے کے سوال کے جواب میں، بغیر کسی استثناء کے کہتے ہیں!

صرف ایک آدمی ہے - ایک تنہا آدمی - جو کہتا ہے 'ہاں'۔ وہ کیا ہے ہاں؟ یہ ایک ایسا ردعمل ہے جس کے پیچھے سراسر نااہلی ہے، تاریکی اور خاموشی کے دور میں مکمل کمزوری، جبر و استبداد کے خلاف، ایک باشعور اور وفادار آدمی جس کے پاس ابھی بھی جہاد کی ذمہ داری ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا فرمان ہے: ہاں! اس کی نااہلی میں بھی ایک 'لازمی' ہے۔ اس کے لیے یہ خیال اور جہاد میں جینا ہے۔

اس طرح، اگر وہ زندہ ہے، زندہ رہنے کے لیے، وہ ایک خیال کے لیے لڑنے کا ذمہ دار ہے۔ زندہ آدمی ذمہ دار ہے، قابل آدمی نہیں، اور حسین سے زیادہ زندہ کون ہے؟ ہماری تاریخ میں حسین سے زیادہ زندہ رہنے کا حقدار اور زندہ رہنے کا زیادہ حقدار کون ہے؟

انسانیت کی روح، باشعور، ایمان، زندہ ہونا، انسان میں جہاد کی ذمہ داری پیدا کرتی ہے اور حسینؑ انسانیت کے زندہ، محبوب اور باشعور ہونے کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

قابلیت یا نا اہلی، کمزوری یا طاقت، تنہائی یا ہجوم صرف مشن کی شکل اور ذمہ داری تک پہنچنے کا طریقہ طے کرتا ہے، اس کی ضرورت نہیں۔ اسے لڑنا ہوگا۔ لیکن اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ اس کے باوجود لڑنا اس کا فرض ہے۔ حسین ان کے حکم کا جواب دیتا ہے اور وہ واحد شخص ہے جس کی رائے 'ہاں' ہے۔ وہ واحد آدمی ہے جو ایسی حالتوں میں اس سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ ہاں! وہ اکیلا آدمی ہے۔ اس نے مدینہ میں اپنا گھر چھوڑ دیا ہے۔ وہ مدینہ سے مکہ گئے ہیں کیونکہ کعبہ کے پاس حج کا موسم ہے جہاں لوگ 'ہاں' کہنے کے لیے جمع ہیں۔

اور اب وہ مکہ چھوڑ رہا ہے۔ وہ جلدی میں ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے اس کی زیارت آدھی ختم ہو چکی ہے، 'کیسے'۔

ہجرت کے ساٹھ سال بعد، رسول اللہ کی وفات کے پچاس سال بعد۔ سب غائب ہیں۔ علی لاپتہ ہے۔ حسن غائب ہے، ابوذر غائب ہے۔ عمار غائب ہے۔ دوسری نسل میں حضر غائب ہے اور اس کے ساتھیوں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ پھانسی کے تختے اکھاڑ دیئے گئے اور خون بہایا گیا۔

خیالات اور خیالات مایوسی، دھندلاپن، بگاڑ، انحراف، خاموشی، خوف میں بدل چکے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا ہے۔ ابو ہریرہ، ابو موسی، شوریح، ابو درداس اور ان سے ملتے جلتے لوگ - جنہوں نے اسلامی انقلاب کے دوران اس شاندار دور میں تکبر اور عزت حاصل کی تھی - رسوا ہو گئے تھے اور ظاہر ہے کہ بے حیائی اور ظلم کے ساتھ بیعت کی تھی۔

جنگجو صحابہ اور مہاجرین سرکاری خزانے کے اصطبل میں سر ٹکا رہے تھے۔ ان کے پیٹ کھانے سے پھولے ہوئے تھے۔ انہوں نے جلادوں کے ہاتھوں اور بازوؤں کو جہاد کے حوالے کر دیا تھا اور ضرورت اور اعتراض کی آڑ میں وہ یزید کے گرد جمع

ہو گئے تھے اور سلامتی کی سرخ تلوار کا سایہ خراسان سے دمشق تک ہر طرف پھیل چکا تھا۔ قتل و غارت، شکست، غداری، سازشیں، فرار، انحطاط اور کالی مایوسیوں نے پوری سلطنت میں موت کو پھیلا دیا تھا اور سانسوں کو پسلیوں کے پنجروں میں قید کر دیا تھا:

بے آواز بستی کے قبرستان میں اُلّو کی آواز بھی نہیں آتی درد والے بے آواز خاموش اور غصے والے خاموش

جنگجوؤں کی مٹھیاں ڈھیلی ہو گئی ہیں اور رسوا ہو کر بھیک مانگنے کی طرف مائل ہو گئے ہیں، چھپ کر یا کھلے عام۔

بے آواز بستی کے قبرستان میں پھانسی کے تختے اکھاڑ کر خون میں نہلائے گئے ہیں۔

ان کی جگہ غصے اور نفرت کی جھاڑیاں اُگتی ہیں اور گھاس پھوس اُگتی ہے۔

اور - ہم - ناراض، بے ایمان رہے ہیں۔

اب وقت ایک آدمی کا منتظر ہے۔ سب کچھ ایک ایسے شخص کی توقع میں ہے جو ان اقدار کو مجسم کرے جو تباہ ہو رہی ہیں، جو ان تمام آدرشوں کی علامتوں کو مجسم کرے جو دوستانہ اور ترک کر دیے گئے ہیں۔ ان نظریات اور اس عقیدے کے مظہر کے حامی دشمن کے ساتھ جا بیٹھے۔ جی ہاں وقت انسان کے عمل کا منتظر ہے۔ تاریخ میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ ہجرت کے ساٹھ سال بعد، آزادی، انصاف اور عوام کے پیغمبر کی وفات کے پچاس سال بعد۔ وہ زمانہ آ پہنچا ہے جہاں سب کچھ چھوٹ رہا ہے۔ انقلاب کے تمام مقاصد تباہ ہو گئے۔ عوام کا پختہ یقین مایوسی پر ہے۔

جی ہاں اس سیاہ دور میں جاہل اشرافیہ کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ اقتدار کو تقویٰ اور تقدس کا لباس پہنایا جا رہا ہے۔ اقتدار یا پالیسی کے لیے قربان ہونے والوں کے دلوں میں اسلام کی پیدا کردہ آزادی اور مساوات کی خواہشیں ٹوٹ رہی ہیں۔ انسانی انقلاب کی جگہ قبائلی جہالت نے لے لی ہے۔ سچی کتاب فریب کے نیزوں

پر رکھی گئی ہے۔ مساجد کے میناروں سے اذان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سنہری بچھڑا اتحاد کی دعوت دے رہا ہے۔ نمرود نے ابراہیم کی جگہ لی۔ قیصر خدا کے نبی کی پگڑی پہنتا ہے۔ جلاد جہاد کی تلوار اٹھاتا ہے۔ ایمان منشیات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ بے حرمتی کے خلاف محنت اور جنگجوؤں کی جدوجہد ہوا کے ساتھ چلی گئی۔ ان کے بدلے منافقین کے لیے خزانے کمائے جاتے ہیں۔ جہاد قتل عام کا ذریعہ بن چکا ہے۔ مذہبی ٹیکس عوام کی لوٹ مار کا ذریعہ ہیں۔ نماز عوام کو دھوکہ دینے کا ذریعہ ہے۔ اتحاد پر بے حرمتی کا نقاب چڑھا ہوا ہے۔ اسلام ہتھیار ڈالنے کی زنجیر بن چکا ہے۔ سنت نبوی حکمرانی کے ستون بن چکی ہے۔ قرآن جہالت کا ذریعہ بن گیا ہے، نبی کے اقوال من گھڑت ہیں۔ تلوار کی چمک ایک بار پھر کندھوں پر اتر رہی ہے۔

قوموں کو پہلے کی طرح غلام بنایا جا رہا ہے۔ آزادی ایک مستقل زنجیر سے جڑی ہوئی ہے۔ خیالات جیلوں میں قید ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔ عوام نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ آزاد پکڑے گئے ہیں۔ لومڑیوں کو گرم رکھا جا رہا ہے۔ بھیڑیوں کو کھلایا جا رہا ہے۔ زبانیں یا تو سونے میں بیچی جاتی ہیں، زبردستی بند کر دی جاتی ہیں یا بلیڈ سے کاٹ دی جاتی ہیں۔

،صحابہ کرام نے ایمان اور جہاد کے دور میں جو عزت و احترام جمع کیا تھا انقلاب کے دوران، مہنگے داموں، وہ سب سستے داموں بک چکا ہے اور ماضی کی عزت کو سول گورنر شپ سے بدل دیا ہے۔ انھوں نے اپنے کندھوں کی ذمہ داری کو روک کر بغاوت کے خطرات کو ٹال دیا تھا اور محفوظ گوشوں میں فرار ہو گئے تھے اور پاکیزہ، پر سکون سنتوں کی طرف بھاگ گئے تھے اور اس طرح اپنی صحت و سلامتی کو باعزت طریقے سے حاصل کیا، ظلم کے خلاف اپنی خاموشی کو بدل کر، بے حیائی کے تابع ہو گئے۔ یا وہ صحرائے ربازہ یا عذرا چرنے کے میدان میں مارے گئے ہیں۔

اب دین اور دنیا بے حیائی اور ظلم کے حق میں چل رہی ہے۔ تلواریں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ گلے کاٹے جاتے ہیں۔ پھانسی کے تختے اکھاڑ دیئے گئے ہیں۔ خون بہایا جا چکا ہے۔

انقلاب کی لہریں، احتجاج کے نعرے، بغاوت کے شعلے سب ٹھنڈے ہو چکے ہیں۔ جوش اور ولولہ کم ہو گیا ہے۔ شہداء کے قبرستانوں کے ساتھ ساتھ زندوں کے سرد اور خاموش قبرستان پر خوف اور گلا گھونٹنے کے سائے پھیل گئے ہیں۔

مسلمانوں کے ایمان اور امید کی تباہ حال جگہ پر اُلّو کی آواز تک نہیں سنائی دیتی۔ نئی جہالت جنت کو سیاہ کرتی ہے۔ یہ سابقہ جاہلیت سے زیادہ وحشی ہے۔ دشمن پہلے سے زیادہ ذہین، زیادہ فاتح اور زیادہ باخبر ہے۔

دانشوروں نے باغیوں کے تلخ تجربات کا مزہ چکھا ہے جس کا نتیجہ انہیں شکست اور شہادت کی صورت میں ملا۔ اچانک اندھیرے میں ایک چنگاری نمودار ہوتی ہے اور خاموشی سے پھٹ جاتی ہے۔ 'ایک شہید جو زمین پر زندہ چلتا ہے' کی چمکیلی شکل۔ اندھیروں کی گہرائیوں سے، بے تحاشا لغزشوں اور مایوسیوں کی دھندلی راتوں میں 'ایک امید' کی روشنی اور طاقتور خصوصیت نظر آتی ہے۔

ایک بار پھر، فاطمہ کے خاموش اور غم زدہ گھر سے، ایک چھوٹا سا گھر جو پوری تاریخ سے بڑا ہے، ایک شخص ابھرتا ہے - غصے میں، پرعزم، ظلم کے تمام محلوں اور طاقت کے محاذوں کے خلاف بغاوت کی حالت میں۔ وہ ایک پہاڑ کی مانند ہے جو اپنے اندر آتش فشاں ہے یا ایک سمندری طوفان کی طرح ہے جسے خدا نے قبیلہ عاد پر بھیجا تھا۔

،فاطمہ کے گھر سے ایک آدمی نکلا۔ وہ مدینہ اور مسجد نبوی، مکہ اور ابرہام ،کعبہ جو نمرود، اسلام اور محمد کے پیغام سے جکڑا ہوا ہے، دمشق کا سبز محل . . بھوکے لوگوں، غلاموں اور کو دیکھتا ہے۔

فاطمه کے گھر سے ایک آدمی نکلا۔ تمام ذمہ داریوں کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال دیا گیا ہے۔ وہ عظیم مصیبت زدہ انسان کا وارث ہے۔ وہ آدم، ابراہیم، محمد .کا واحد جانشین ہے۔ . . ایک تنہا آدمی

لیکن نہیں! ایک عورت فاطمه کے گھر سے نکلی ہے، اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ وہ اپنے بھائی کے بھاری مینڈیٹ کا نصف اپنے کندھوں پر اٹھاتی ہے۔ فاطمه کے گھر سے ایک آدمی نکلا۔ تنہا، بے دوست، خالی ہاتھوں سے وہ دہشت کا مقابله تاریکی اور تلوار سے کرتا ہے۔ اس کے پاس صرف ایک ہتھیار ہے - موت۔ لیکن وہ اس گھرانے کا بیٹا ہے جس نے زندگی کے اسکول میں مرنے کا فن خوب سیکھا ہے۔ پوری دنیا میں اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا که 'مرنا کیسے ہے'۔ اس کا طاقتور دشمن جو دنیا پر حکومت کر رہا ہے اس علم سے محروم ہے۔ یہی وجه ہے که اس تنہا ہیرو کو اپنے دشمن کی بے پناہ فوج پر اپنی فتح کا اتنا یقین اور اتنا پرعزم ہے۔ وہ بلا شبه اس کا مقابله کرتا ہے۔

شہادت کا عظیم معلم اب اس لیے پیدا ہوا ہے که جہاد کو صرف ان لوگوں سے جوڑنا جن کے پاس استطاعت اور فتح صرف فتح میں ہے۔ شہادت کوئی نقصان نہیں ہے، یه ایک انتخاب ہے، انتخاب ہے، جس کے تحت جنگجو آزادی کے مندر اور محبت کی قربان گاہ کی دہلیز پر اپنے آپ کو قربان کرتا ہے اور فتح یاب ہوتا ہے۔

بنی نوع انسان کو زندگی بخشنے والے آدم کے وارث حسین اور عظیم انبیاء کے جانشین، جنھوں نے بنی نوع انسان کو 'جینے کا طریقه' سکھایا، اب بنی نوع انسان کو 'مرنے کا طریقه' سکھانے آئے ہیں۔

ہوسین سکھاتا ہے که 'سیاہ موت' ان عاجز لوگوں کی بد قسمتی ہے جو زندہ رہنے کے لیے طعنه قبول کرتے ہیں۔ کیونکه موت ان لوگوں کو چنتی ہے جو شہادت کا انتخاب کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ موت انہیں چنتی ہے! میں جو کچھ کہه رہا ہوں اس کی اعلیٰ ترین صورت لفظ شاہد، شہید پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلب ہے حاضر ہونا، گواہی دینا، گواہی دینے والا۔ اس کا مطلب یه بھی ہے که جو

،سمجھدار اور قابل ادراک ہے، وہ جس کی طرف سب رجوع کرتے ہیں۔ آخر میں اس کا مطلب ہے، ماڈل، نمونہ، مثال۔

شہادت: ہماری ثقافت اور ہمارے مذہب میں اٹھنا اور گواہی دینا کوئی خونی اور حادثاتی واقعہ نہیں ہے۔ دیگر مذاہب اور قبائلی تاریخوں میں شہادت ان ہیروز کی قربانی ہے جو دشمن کی لڑائیوں میں مارے جاتے ہیں۔ اسے غم سے بھرا ایک افسوسناک حادثہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مارے جانے والے شہید کہلاتے ہیں اور ان کی موت کو شہادت کہتے ہیں۔

لیکن ہماری ثقافت میں شہادت ایسی موت نہیں ہے جو ہمارے جنگجوؤں پر دشمن کے ذریعے مسلط کی جائے۔ یہ ایک ایسی موت ہے جو ہمارے جنگجو کی طرف سے مطلوب ہے، جسے انسان کے اندر موجود تمام تر شعور، منطق، استدلال، ذہانت، فہم، شعور اور ہوشیاری کے ساتھ منتخب کیا گیا ہے۔ حسین کو دیکھو۔ وہ اپنی جان چھوڑ دیتا ہے، اپنی بستی چھوڑتا ہے اور مرنے کے لیے اٹھتا ہے کیونکہ اس کے پاس اپنے دشمن کی مذمت اور رسوا کرنے کی جدوجہد کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اس کا انتخاب اس دھوکہ دہی کے پردے کو ہٹانے کے لیے کرتا ہے جو حکمران طاقت کے بدصورت چہروں کو ڈھانپتے ہیں۔ اگر وہ اس طرح دشمن کو شکست نہیں دے سکتا تو کم از کم انہیں رسوا کر سکتا ہے۔ اگر وہ حکمراں طاقت کو فتح نہیں کر سکتا تو کم از کم اس کی مذمت کر سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے انقلاب کی اس دوسری نسل کے مردہ جسموں میں نیا خون اور جہاد کا عقیدہ ڈال کر۔

وہ ایک غیر مسلح، بے اختیار اور تنہا آدمی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی جہاد کا ذمہ دار ہے۔ اس کے پاس مرنے کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اس نے خود کو ایک سرخ موت' چن لیا ہے۔ حسین ہونا اسے ان تمام بدعنوان اور ظالموں کے خلاف' جہاد کرنے کا ذمہ دار بناتا ہے۔ اس کے پاس اپنے جہاد کے لیے اپنی موت کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اسے لے لیتا ہے اور صرف پھانسی کی جگہ میں

داخل ہونے کے لیے اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنی درست منصوبہ بندی، استدلال، شاندار، درست اور منصوبہ بند روانگی، نقل و حرکت اور ہجرت کے ساتھ اس کو کتنی اچھی طرح انجام دیا۔ مرحلہ وار، وہ راستہ صاف کرتا ہے، اس مقصد کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ کس مقصد کی طرف بڑھ رہا ہے، ساتھیوں کے ایک انوکھے انتخاب کے ساتھ- وہ مرد جو اس کے ساتھ مرنے آئے تھے- اور ساتھ ہی اس کے خاندان کے تمام افراد۔ یہ وہ سب چیزیں ہیں جو اس کے پاس اس دنیا میں ہیں اور وہ انہیں شہادت کی قربان گاہ پر قربان کرنے کے لیے لے جاتا ہے۔

ایمان کی وہ تقدیر جو تباہ ہو رہی ہے، ان لوگوں کا انجام جو اسلامی عدل و آزادی کے منتظر ہیں لیکن اب دور جاہلیت سے بھی بدتر ظلم و جبر میں گرفتار ہو چکے ہیں، اب اس کے عمل کے منتظر ہیں۔

جس کے پاس نہ کوئی ہتھیار ہے اور نہ کوئی وسیلہ وہ اپنے تمام وجود، اپنے اہل و عیال، اپنے عزیز ترین ساتھیوں کے ساتھ آیا ہے تاکہ اس کی اور اس کے پورے خاندان کی شہادت اس بات کی گواہی دے کہ اس نے اپنی ذمہ داری کو ایسے وقت میں نبھایا جہاں حق بے دفاع اور غیر مسلح تھا۔ وہ گواہی دیتا ہے کہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے سنا ہے کہ جنگ عاشورہ میں محرم کی دسویں تاریخ کو امام حسین علیہ السلام اپنے بچے علی اصغر کے گلے سے بہنے والے خون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آسمان کی طرف پھینکتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھو میری طرف سے اس قربانی کو قبول فرما، میرے اللہ گواہ رہنا۔

اسی دور میں انسان کا 'مرنا' کسی قوم کی 'زندگی' کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کی شہادت ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ایمان باقی رہ سکتا ہے۔ یہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ بڑے بڑے جرائم، فریب، ظلم اور جبر کا راج ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سچائی کو جھٹلایا جا رہا ہے۔ یہ ان اقدار کے وجود کو ظاہر کرتا ہے

جو تباہ اور فراموش ہیں۔ یہ ایک کالی خودمختاری کے خلاف سرخ احتجاج ہے۔ یہ خاموشی میں غصے کی چیخ ہے جس نے زبانیں کاٹ دی ہیں۔

شہادت اس بات کی گواہی دیتی ہے جسے وہ تاریخ میں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اس چیز کی علامت ہے جس کا ہونا ضروری ہے۔ اس خاموش اور خفیہ وقت میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی گواہی دے رہا ہے اور آخر کار شہادت ہی وجود کی واحد وجہ، موجود ہونے کی واحد نشانی، حملہ اور دفاع کا واحد ذریعہ اور مزاحمت کا واحد طریقہ ہے تاکہ حق، حق اور انصاف ایسے دور میں زندہ رہ سکے جس میں فضول، باطل اور جبر کا راج ہو۔

اس نے تمام اڈوں کو شکست دی ہے۔ اس نے تمام محافظوں اور وفادار پیروکاروں کا قتل عام کیا ہے۔ 'انسان ہونا' زوال کی دہلیز پر کھڑا ہونا اور ہمیشہ کے لیے مرنے کا خطرہ ہے۔ یہ تمام معجزات شہادت کے ذریعہ انجام پاتے ہیں: اٹھنا اور گواہی دینا۔

ہجرت کے ساٹھ سال بعد اس سیاہ اور خاموش قبرستان پر ایک نجات دہندہ نمودار ہونا چاہیے۔ اور حسین، اپنے مینڈیٹ سے واقف ہے جسے تاریخ کی انسانیت سے نفرت نے اپنے کندھوں پر ڈال رکھا ہے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مکہ چھوڑ کر اپنے مقام شہادت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جانتا ہے کہ تاریخ اس کی منتظر ہے۔ وقت جو رجعت پسندوں اور مشرکوں کے ہاتھ میں ہے، اسے ایک قدم آگے بڑھنے کا انتظار ہے۔

جو لوگ قید ہیں، بے حرکت ہیں اور خاموش ہیں، غلامی میں ہیں، انہیں اس کی حرکت اور اس کی پکار کی سخت ضرورت ہے۔ آخر کار وہ مشن جو اب شیطانوں کے ہاتھ میں ہے، اس کی موت کا حکم دیتا ہے تاکہ اس کے ساتھ وہ تباہی کی گواہی دے سکے۔ کہا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا تھا کہ اللہ چاہتا ہے کہ آپ کو قتل کر دے۔

ہمارے انسانی فلسفے میں شہادت کا بھی ایک خاص مطلب ہے۔ ایک ایسی نوع انسانی کی تخلیق جو خدا اور شیطان کا مرکب ہے، روح اور مٹی کا مرکب ہے اور ،ادنیٰ اور بلند ترین چوٹیوں کا مجموعہ ہے، مذہب اور اس کی تلاوت، عبادات عبادات، فقہ، اعمال صالحہ، خدمات، سائنس اور یہ سب کچھ صرف اور صرف اس کی جدوجہد اور مشقیں ہیں جو انسان کو اس کے اعلیٰ درجے کے لیے اپنے ضعیف ہونے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس کے شیطان کی مٹی اس کے الہی روحانی حصے کے حق میں۔ لیکن شہادت وہ عمل ہے جسے انسان اچانک اور انقلابی طریقے سے انجام دیتا ہے اور اپنے کمتر وجود کو محبت اور ایمان کی آگ میں جھونک دیتا ہے اور اسے نور اور الہٰی وجود میں بدل دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شہید کو نہ وضو کرنے کی ضرورت ہے، نہ کفن کی ضرورت ہے اور نہ قیامت کے دن حساب دینے کی ضرورت ہے۔ ایک شہید موت سے پہلے خطا اور گناہ کی قربانی دے چکا ہے اور اب گواہی دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عاشورہ سے پہلے شام کو امام حسین علیہ السلام احتیاط سے دھوتے ہیں، خوب شیو کرتے ہیں، اپنے بہترین کپڑے پہنتے ہیں، بہترین عطر استعمال کرتے ہیں۔ موت کے خون کے بہاؤ کے درمیان وہ اپنا سب کچھ تباہ کر دیتا ہے اور رخصتی کی دہلیز پر یہ دیکھ کر کہ شہداء کی تعداد ایک دوسرے پر گرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے، اس کی قسمت مزید سرخ اور مزید سنسنی خیز ہو جاتی ہے۔ اس کا دل جوش کے ساتھ تیزی سے دھڑکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی 'موجودگی' کا فاصلہ کم ہو رہا ہے اور شہادت خود حاضری ہے۔

شہادت، خلاصہ یہ کہ، ہماری ثقافت میں، دوسرے مکاتب فکر کے برعکس ،جہاں اسے ایک حادثہ، ملوث ہونا، ہیرو پر مسلط موت، ایک المیہ، ایک درجہ ایک درجہ، ایک درجہ ہے۔ یہ ایک ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ خود ایک مقصد ہے۔ یہ اصلیت ہے۔ یہ ایک تکمیل ہے۔ یہ ایک لفٹ ہے۔ یہ خود انسانیت کی بلند ترین چوٹی کا درمیانی راستہ ہے اور یہ ایک ثقافت ہے۔

تمام زمانوں اور صدیوں میں جب کسی عقیدے اور ایک نظریے کے پیروکار طاقت رکھتے ہیں تو وہ اپنی عزت و آبرو کی ضمانت دیتے ہیں اور جہاد کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن جب وہ کمزور ہو جاتے ہیں اور ان کے پاس جدوجہد کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی، تحریک، ایمان، عزت، آبرو، مستقبل اور تاریخ شہادت کی ضمانت دیتے ہیں۔ شہادت تمام زمانوں اور نسلوں کے لیے دعوت ہے کہ اگر مار نہیں سکتے تو مر جاؤ۔